بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسالہ

متروکاتِ سخن

یعنی

باب اول کتاب نکاتِ سخن

مصنفہ

سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اردوئے معلی کانپور

جسمیں

(۱) متروکات قدیم (۲) متروکات معروف (۳) متروکات بیانی (۴) متروکات بیجا الاہد (۵) قابل ترک الفاظ کی تفصیل اور تحقیق بڑی کاوش اور کوشش کیساتھ مع متعدد مثالوں کے درج کی گئی ہے

جسکو

حاجی شمس الدین نے اپنے

رئیس المطابع واقع کانپور میں چھپایا

اور حسرت موہانی نے شائع کیا

طبع دوم ۶۲۵ جلد — ۱۹۳۲ء — قیمت فی جلد ۶ر

[illegible]

متروکات جائز

(۱) اُس پاس۔ اُس کنے۔ (۲) آن کہ (۳) آکے سے جائے ہے (۴) "اودی" بجائے "اودھا" (۵) الفاظ فارسی مثل ناگوار۔ گذار وغیرہ۔ (۶) بلیے (۷) پیسے (۸) پنے بجائے پن۔ (۹) پہ بجائے پر (۱۰) پاسے (۱۱) بیچ (۱۲) تھوڑی بجائے تھوڑا ہی۔ (۱۳) جوں بمعنی مانند (۱۴) "جو کہ" "کہ جو" بجائے "جو" (۱۶) عاقبت (۱۷) کیونکہ بجائے کیونکر (۱۸) کیجے دیجے بجائے کیجیے دیجیے (۱۹) کہیو دیجیو (۲۰) گر بجائے اگر (۲۱) لیوے دیوے (۲۲) لگ چلنا (۲۳) مارے (۲۴) مگر بمعنی شاید (۲۵) "نے" بجائے "نہ" (۲۶) وصلت (۲۷) ولیک و لے۔ لیک۔ ولیکن۔

متروکات بیجا

(۱) مت (۲) یاں واں (۳) تلک (۴) اور بروزن فع (۵) سُو وغیرہ۔۔

قابل ترک

(۱) الفاظ کریہ نیز الفاظ متعلق بہ کفن۔ دفن۔ لاش وغیرہ (۲) الفاظ فارسی کا استعمال بلا اضافت (۳) تخفیفات بزرگان (۴) آپ جیسا بجائے آپ سا (۵) الف ندائیہ مثلاً "دلا" (۶) ترکیب فارسی کیساتھ جمع کے بجائے واحد کا استعمال (۷) لون بمعنی نمک (۸) سالہا بجائے سالہا سال (۹) مغان جمع بجائے واحد (۱۰) میرے زبان بہار (۱۱) "نہ" بجائے "نہیں" (۱۲) یہ معنی اسقدر

باب دوم معائب سخن

(۱) عیب تنافر (۲) تکرار الفاظ قبیح (۳) الف بجائے ہائے مختفی (۴) تعقید لفظی۔ (۵) حذف حرف مثل کا۔ کو۔ تو۔ نہ۔ پر وغیرہ (۶) "ی" کا دب کر نکلنا (۷) واؤ کا دب کر نکلنا (۸) الف کا دب کر نکلنا (۹) نقص روانی قسم اول عمومی۔ (۱۰) نقص روانی قسم دوم خصوصی موسوم بہ ضعف خاتمہ (۱۱) تشدید یائے معروف بحالت اضافت (۱۲) قافیہ معروف و مجہول (۱۳) اعلان نون بترکیب فارسی (۱۴) شتر گربہ (۱۵) الفاظ مخصوص بہ زنان و مردان (۱۶) توالی اضافات (۱۷) استعمال صفت بلا موصوف (۱۸) عطف درمیان الفاظ ہندی و فارسی (۱۹) ابہام و اشکال مضمون (۲۰) استعمال الفاظ غیر شاعرانہ (۲۱) عیب ایطاد

دیگر عیوب قافیہ (۲۱) سقوط "ع" "ی" "ک" وغیرہ (۲۲) غلط العوام (۲۳) شکست ناروا۔ (۲۴) حشو و زوائد (۲۵) ذوبنی مشتقات مصدر کا استعمال۔

باب سوم محاسن سخن

(۱) تکرار الفاظ حسین، (۲) صدق محاورہ۔ صفائی بیان۔ سادگی زبان (۳) ترجمۂ محاورۂ فارسی (۴) شوخیٔ کلام و ندرتِ مضمون (۵) تازگی بیان و ندرت مضمون (۶) خوبیٔ ترکیب حُسن استعارہ و لطفِ تشبیہ (۷) حسن استعمال الفاظ جمع مخصوص بہ خاندان مومن (۸) واقعہ گزاری۔ جذبہ نگاری و معاملہ بندی (۹) متانت و بلندی جذبات۔ مسائل تصوف (۱۰) مطابقت الفاظ و مضمون (۱۱) نقل قول کی تازگی (۱۲) کنایہ (۱۳) سوز و گداز (۱۴) الفاظ کا الٹ پھیر اور مصرعوں کا تقابل (۱۵) استعمال جملہ انشائیہ بجائے خبریہ (۱۶) تعدد الفاظ و فقرات موزون (۱۷) سہل ممتنع۔

باب چہارم نوادر سخن

(۱) فعل لازم کیساتھ "نے" کا استعمال (۲) سوائے اسکے (۳) میرے بجائے اپنے (۴) پا یا بجائے ملا (۵) افعال جمع کیساتھ اسمار کا بھی جمع استعمال (۶) بعض الفاظ ہند کی ندرت (۷) بھولنا کے دو استعمال (۸) فقرہ میں ہائے مخفی کا استعمال (۹) اپنے کا خاص استعمال مثلاً محاورۂ پنجاب (۱۰) کون بجائے کس (۱۱) وہ خبر ہوا بجائے اسے خبر ہوئی (۱۲) معلوم ہوئے بجائے خدا جانے وغیرہ۔

باب پنجم اصلاح سخن

نمونہ غزلیات حسرت موہانی و دیگر شعرا بحالت تکمیل نیز بحالت ابتدا مع نمونہ تبدیلی الفاظ بتدریج برائے نومشقان۔ فقط۔

باب اول متروکات سخن

فصل اوّل متروکات قدیم

اس فصل میں اُن متروکات کا ذکر ہے جو شعرائے دورِ اول کے زمانے میں عام طور سے رائج تھے اساتذہ میں سب سے پہلے شاہ حاتم نے اصلاحِ زبان کی جانب توجہ کی اور بعض ناگوار الفاظ کو متروک قرار دیکر اُنکی ایک فہرست اپنے انتخاب کلیات موسوم بہ دیوان زادہ میں درج کردی مگر پورے طور پر یہ الفاظ خود اُن سے بھی نہ چھوٹ سکے تا بدیگراں چہ رسد چنانچہ دورِ اول سے گزر کر دورِ دوم وسوم بلکہ چہارم کے بھی بعض بعض شاعروں کی غزلوں میں کہیں کہیں ان الفاظ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

دورِ حاضر میں البتہ یہ الفاظ یکقلم متروک سمجھے جاتے ہیں بلکہ شاید بعض کے تو مفہوم سے بھی اِس زمانے میں کم لوگ آگاہ ہونگے، مثلاً انجھوان بمعنی آنسو۔ باج بمعنی سوا سیتی بجائے سے ثمن بمعنی مانند وغیرہ۔

مگر ہمنے ایسے الفاظ کو بھی مع مثال و معنی درج کردیا ہے۔ تاکہ زمانۂ حال کے شعرا کو متقدمین کا کلام دیکھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو اور یہ فہرست انکے لئے ایک فرہنگ کا کام دے۔

اگرچہ یہ الفاظ زیادہ تر متقدمین ہی کے کلام میں پائے جاتے ہیں مگر مثالیں ہمنے عموماً شعرائے دورِ دوم وسوم کے اشعار سے دی ہیں جسکا مقصد دیباچے میں بیان کیا جاچکا ہے کہ محاسنِ سخن کیطرح معائبِ متروکاتِ سخن کی مثالیں بھی دلچسپی و دلپذیری کی شان سے خالی نہ رہیں اور اسطرح پر یہ پوری کتاب ایک پسندیدہ بیاض کا کام دے سکے۔

حرف "الف"

(۱) اب لگ ۔ یعنی اب تک ۔ ذکی ۔ ؎

جوں نسیم اب لگ سحر گردی مجھے حاصل نہیں — کسطرح اُس غنچۂ بندِ قبا کو وا کروں

(۲) اُپر بجائے اوپر۔ یہ لفظ دورِ دوم تک مستعمل رہا اسکے بعد متروک ہوگیا۔

مثلاً ولی ؎

جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں — اُس گرد کوں ہیں سرمہ کردن دیدۂ جان کا

حاتم ؎ گر گلشن اُپر سایہ پڑا اُس بیمروت کا — کہ پھر ہر کسی گل کے نہ دیکھا رنگ اُلفت کا

میر ؎ حیف جو وہ نسخۂ دل کے اُپر — سرسری سی ایک نظر کر گیا

(۳) اُپس بجائے اپنے مثلاً ولی ؎

اے سرو گل اندام اپس نقشِ قدم سوں — بجا ہے اگر صحن کو گلپوش کرے توں

(۴) اُبجانا یعنی چھیڑنا۔ اُبھارنا۔ مثلاً میر حسن ؎

ہوش میں ہوش نہیں جب سے سنا ہے مطرب — پھر ٹک اُبجا ہوا اُسکو وہ ترانا کیا تھا

(۵) آگو یعنی آگے یا "پہلے سے" مثلاً مصحفی ؎

سوزِ دل اپنا اُسکو کیا مصحفی سناؤں — آگو ہی وہ پھرے ہے کانوں میں شال باندھے

(۶) انجھواں۔ یعنی آنسو مثلاً ولی ؎

سیہ روئی نہ لیجا حشر میں دنیائے فانی سوں — سیہ نامے کو دھو لے بیخبر انجھواں کے پانی سوں

(۷) انکھڑیاں۔ یہ لفظ دورِ چہارم تک رائج تھا بلکہ شاید کسی کسی موقع پہ جہاں آنکھوں کا نام پیار سے لینا مقصود ہو اب بھی جائز ہے مثلاً مجبور شاگرد مصحفی ؎

جب انکھڑیوں میں تری نشہ کا خمار آیا — کہا یہ مجھ عجب ابرِ نوبہار آیا

نکی مرادآبادی ؎ آشکارا ہے لبِ ساقی سے مینا کی بات — انکھڑیاں متوالیاں کہتی ہیں میخانے کی بات

آتش ؎ ان انکھڑیوں میں گردشِ شراب آیا — سلام جھک کے کرے گا جو پھر جواب آیا

(۸) انکھوں کا۔ بجائے انکا یا انکھوں سے بجائے ان سے مثلاً میر حسن ؎

تربت پہ بیکسوں کی دیکھو نہ پھول کوئی — گل کی جگہ انکھوں کا داغِ جگر رہے گا

میر سوز ؎ نہ سمجھو آشنا خوباں ہے ہرگز مجھ دوانے کو (دیوانہ) — مجھے نسبت انکھوں سے کیا وہ شہری میں بیابانی

(۹) اودھر بجائے ادھر مثلاً میر ؎

رہا تھا دیکھ اودھر میر چلتے — عجب اک ناامیدی تھی نظر میں

(۱۰) اُودھر یعنی طرف سمت۔ مثلاً میر ؎

تمہیں بھی چاہیئے ہے کچھ تو پاس الفت کا — ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں

(۱۱) آونا بجائے آنا مثلاً قائم چاندپوری ؎

اب ترے آونے کا کیا حاصل — کام اپنا تو بس تمام ہوا

حرف "ب" کا

(۱) باج بمعنی سوا مثلاً ولی ؎

اس باج دل میں میرے نہیں اور مدعا — اس دل کے مدعا کو ہمارا سلام ہے

(۲) بانچوں بمعنی پڑھوں مثلاً قائم چاندپوری ؎

منفذ نگہ کا آنسو گھیرے ہی لیں ہیں پیارے — بانچوں سو کسطرح سے اب میں تمہن کی پاتی (تمہارا خط)

(۳) باو بمعنی ہوا مثلاً میر حسن ؎

سینکڑوں عالم دکھاتا ہے حسن دلبر کے ساتھ — ٹھنڈی ٹھنڈی باو اور چھٹکی پہر کی چاندنی

یہ لفظ دور دوم و سوم سے گذر کر دور چہارم بلکہ دور پنجم کے بھی بعض اساتذہ متقدمین کے کلام میں پایا جاتا ہے مثلاً خواجہ وزیر ؎

خاک میری لے اڑا اُس پری رو کی طرف — باو کا جھونکا مجھے تخت رواں ہوجائیگا

(۴) بعداز بجائے بعد مثلاً میر سوز ؎

نہیں یہ سوز چھوڑنے کے بعداز کبھی تجھے چھوڑے

(۵) بکائیں بجائے بکیں مثلاً میر تقی میر ؎

بکائیں تو بازار مصر میں جب — کہ واں بیچتے تھے خریدار کو

(۶) بوئے - بہ واو مجہول بجائے بو مثلاً ولی ؎

جاتا ہوں باغ یاد میں اُس مشکیں کی ولی — شاید کہ بوئے اُنکی ہو نرگس کی باس میں

(۷) بھیتر بجائے اندر مثلاً ولی ؎

ولی کے دل کو کیوں ہوتی راحت تجھ نگہ کی بھیتر — کہ جوں ہوتی ہے خاطر سیر کشمیر کے دیکھے

حرف "پ" کا

(۱) پاتی بمعنی خط مثلاً قائم چاندپوری ؎

قاصد کو دے نہ اے دل اس گلبدن کی پاتی — چل خود ہی لے چلیں ہم اپنے سجن کی پاتی

(۲) پکار رہا، یعنی پکارتا رہ گیا۔ یا پکار کر رہ گیا۔ اسکے متروک ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض موقعوں پہ غالبًا بضرورت شعری متاخرین نے بھی اسکے استعمال کو جائز رکھا ہے مثلاً شوکی مرادآبادی ؎

کسی نے بھی مری افتادگی پہ کی نہ نگاہ — عدم کے قافلے والوں کو میں پکار رہا

عاشق دہلوی شاگرد غالب ؎

شب فراق میں درد والم ہی یار رہا — قضا نے پھر کے نہ دیکھا بہت پکار رہا

پابندیٔ زبان قدیم کے زمانہ کے ساتھ اسی قسم کا ایک محاورہ راقم حروف کے ایک شعر میں بھی نظم ہو گیا ہے مثلاً ؎

دیکھ رہتی ہیں اسے شوق کی آنکھیں ہر دم — اک ملی تھی جو کبھی آپ کی تحریر مجھے

بہر حال یہ محاورہ متروکات قدیم میں سے ہے اور مشاقان کامل کے سوا کسی کیلئے اسکا استعمال جائز نہیں ہے۔

(۳) پہ، یعنی پاس۔ آج بدایوں، علیگڑھ وغیرہ بعض اضلاع میں عوام الناس کی زبان سے اب بھی کبھی کبھی یہ لفظ سننے میں آ جاتا ہے۔ مثلاً زید سے چاقو مانگا جائے تو جواب میں وہ کہے گا کہ وہ پہ نہیں ہے یعنی ہمارے پاس نہیں ہے۔ تاہم اسکا متروک اور ناجائز ہونا مسلم ہے۔ اور کم سے کم نظم میں اسکا وجود نہیں پایا جاتا۔ باستثنائے شعر مصحفی ؎

دل مجانِ خوبان میں جو گم رات ہوا تھا — صد شکر اُسی محرم ہمراز پہ نکلا

(۴) کھیر، بجائے پھر۔ مثلاً مستور کاکوروی شاگرد مصحفی ؎

یوں کوئی شبِ وصل میں سوتا ہے تکلف کھیر — صدقے میں اس ادا کے تو منھ تو ادھر کھیر
شدت میں کسی کا ہے کو کرتا ہے تو ظالم — مر کر مجھے جینا نہیں اے درد جگر کھیر

قائم ؎ کل کی شب کس طرح کٹی قائم — آج کا روز پھیر شام ہوا

(۵) پیا، یعنی محبوب۔ ہندی زبان میں ابتک رائج ہے۔ اردو میں البتہ متروک ہے۔

ولی ؎ ناندادا سوں دل کو مرے مبتلا کیا — اس نازنین پیا کو ہمارا سلام ہے

حرف "ت"

(۱) تاکہ ۔ یعنی جبتک ۔ مثلاً غالبؔ ؎

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ — آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہو

(۲) تجھے قید بجائے تیری قید وغیرہ مثلاً سوداؔ ؎

تجھے قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا — لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا

میرؔ ؎ دیکھیگا جو تجھے رو کو سو حیران رہیگا — وابستہ ترے مو کا پریشان رہیگا

(۳) تسبی بجائے تسبیح مثلاً شاہ مبارک آبروؔ ؎

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آئے — تسبی کرے فرامش زنار بھول جائے

(۴) تلے بجائے نیچے مثلاً مہر لکھنوی ؎

اسکو لذت عشق کی ، اصلا نہیں — جو ترے خنجر تلے تڑپا نہیں

(۵) تلک یعنی تک ۔ مثلاً میرؔ ؎

جُدا جو پہلو سے وہ دلبر یگانہ ہوا — تپش کی یاں تلک دل نے کہ درد شانہ ہوا

(۶) تین بجائے تونے ۔ مثلاً آبروؔ ؎

سیاہی کا ہوا ہے روشنی نام — لگا جب سے تین آنکھوں میں کاجل

نواح فتحپور و الہ آباد وغیرہ بعض مشرقی اضلاع صوبہ متحدہ میں عوام الناس تونے کی جگہ تین نے اب بھی بولتے ہیں ۔ قدماے بدستور علامت فاعل "نے" کو بھی حذف کرکے تونے کے بجائے صرف تین پر اکتفا کرتے تھے جیساکہ آبروؔ کے شعر میں ہے ۔

حرف "ج"

(۱) جاگہ ۔ جگہ مثلاً میر حسنؔ ؎

جیسا پیتے باتین کی تھیں کوٹھے ہوا کدن — جب دیکھا وہ جاگہ بے اختیار رو دیا

مصحفیؔ ؎ جنوں تھی دلسے ہیں مہربانی آپکی — ہم لیے پھرتے تھے ہر جاگہ کہانی آپکی

میرؔ ؎ ہمارا ہے احوال حیرت کی جاگہ — جو دیکھیگا وہ بھی نظر کر رہے گا

حیرت کی جاگہ یعنی جائے حیرت ہے ۔ نظر کر رہیگا یعنی حیرت سے دیکھکر رہ جائیگا ۔

(۲) جا ہے - بجائے جائے ہے "جاتا ہے" کی جگہ جائے ہے۔ خود متروکات جائز میں داخل ہے
قدما ضرورت شعر کی بنا پر مزید تصرف کر کے کبھی کبھی جائے ہے کی جگہ صرف "جا ہے" لکھ دیا کرتے
تھے۔ مثلاً میر ؎

اس حرف ناشنو سے صحبت بگڑ ہی جا ہے — ہر چند لاتے ہیں ہم باتیں بنا بنا کر

قائم ؎ جیتے تب تجھ سے جو تم ولی کی طلب کرتے ہو — دل کہیں مفت دیا جا ہے غضب کرتے ہو

(۳) جائے بمعنی جا، جگہ۔ اس لفظ کو دہلی کے بعض متاخرین نے بھی استعمال کیا ہے مثلاً

مومن ؎ کر دیے اپنے آنے جانے کے — تذکرے جائے جائے لوگوں نے

صابر ؎ یعنی واں چلیے کہیں جائے گذر — شعرا دفن کرتے ہیں

(۴) جدھر تدھر۔ مثلاً خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ ؎

پھرتے ہو تم بنائے سج اپنی جدھر تدھر — لگ جائے دیکھیو نہ کسی کی نظر کہیں

(۵) جریمانہ بجائے جرمانہ۔ مثلاً انشا ؎

لیجیے اسکی بدل آپ جریمانے میں — گم ہوئی تجھ سے جو کل رات کو سرکار کی گیند

بدل بمعنی عوض عوام کی زبان ہے انشا نے اس شعر میں زبان عوام کا استعمال غالباً قصداً کیا ہے
جواب بھی جرمانہ کی جگہ جریمانہ بلکہ جربانہ بولتے ہیں۔

(۶) جوں بمعنی مانند مثلاً ولی ؎

سینے میں ہے تجھ ابرو کے پیوست کی نشست — جوں تیر دل میں ہے نگہ مست کی نشست

(۷) جوں کر . . . بمعنی جس طرح مثلاً ولی ؎ (تیرے ابرو) کمان آغوش جوں کر کھولتی ہے تیر کے خاطر

(۸) جھجوں کے بجائے جھکے مثلاً میر حسن ؎

اب رفتہ رفتہ باتیں وہ ہموار ہو گئیں — آگے جھجوں کے نام سے جی کو ملال تھا

(۹) جیدھر بجائے جدھر مثلاً خواجہ میر درد ؎

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ — جیدھر ملے وہ ابرو ادھر نماز کرنا

(۱۰) جیوڑا بمعنی جی مثلاً سودا ؎

سنبھالے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا — کہ لے لے ہچکیاں جیوڑا نکل جاتا ہے شیشے کا

(۱۱) چلنے ہار یعنی چلنے والے۔ یہ وہی ترکیب ہے جیسے مرن ہار، ہونہار وغیرہ مثلاً میر ؎

آجکل بیقرار ہم بھی ہیں — بیٹھ جا چلنے ہار ہم بھی ہیں

(۱۲) چھٹ یعنی سوا۔ مثلاً سودا ؎

ہو یہ دیوانہ مرید اس زلف چھٹ کس پیر کا — سلسلہ بہتر ہے سودا کے لئے زنجیر کا

(۱۳) چھینا کر بجائے چھین کر۔ مثلاً میر حسن ؎

ہمارے ہاتھ سے ساغر چھینا غیروں کو دیتا ہے — خدا کیواسطے ٹک دیکھیو خوبی بہکنے کی

ساغر چھینا یعنی ساغر چھین کر۔ یہاں میر حسن نے حسب معمول قدما صرف چھینا لکھا ہے "کر" کو بھی حذف کر دیا ہے۔

حرف "خ"

(۱) خدا جانئے بجائے خدا جانے مثلاً سودا ؎

یار آزردہ ہمارا ہے جو بیہوشی میں — کیا ہوا ہے خدا جانئے بیہوشی میں

(۲) خوشی بجائے خوش مثلاً آتش ؎

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد — خوشی پھرتے ہیں باغبان کیسے کیسے

حرف "د" "ڈ" "ذ"

(۱) داب رہا یعنی داب داب کر رہ گیا مثلاً میر مشتون ؎

نہ رہا پر نہ تپش سے دل بیتاب رہا — رات کیا کیا انہیں ہاتھوں سے نہیں داب رہا

(۲) درس یعنی دیدار۔ مثلاً ولی ؎

ہمکو برداشت نہیں غصے کی — غیر کو درس دکھایا نہ کرو

(۳) دسنا۔ یا دکھنا یعنی نظر آنا مثلاً ولی ؎

دسنا ہے تجھ جبیں میں سراسر ظہور صبح — تجھ دیکھنے کو جگ میں ہوا ہے عبور صبح

بعض اضلاع میں عوام الناس اور جہلا کی زبان پر نظر آنے کی جگہ دکھنا۔ بلکہ دیکھنا بائے معروف اسوقت تک جاری ہے۔

(۴) دن پہ دن یعنی روز بروز۔ عوام الناس کی زبان سے اب بھی سننے میں آتا ہے۔ مثلاً

آبرو ؂

بڑھے ہے دن بدن تجھ مکھ کی تاب آہستہ آہستہ   کہ جوں کر گرم ہووے آفتاب آہستہ آہستہ

(۵) دکھ دہی - بجائے دکھ دینا - ہندی الفاظ کیساتھ ترکیب فارسی کی آمیزش قدما کا عام دستور ہے - مثلاً قائم ؂

ہر چند دکھ دہی سے زمانے کو عشق ہے   لیکن مرے بھی تاب کے لانے کو عشق ہے

(۶) دوجا - بجائے دوسرا - ولی ؂

دلبر آیا اک نظر میں آج میری خوش ادا   خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہوں دوجا دلربا

(۷) دوانا بجائے دیوانہ مثلاً میر سوز ؂

ہوا دلکو میں کتنا کہتا دوانا   پر اُس بیخبر نے کہا کچھ نہ مانا

معین بدایونی ؂ ہوں میں وہ دوانا کہ بہار آنے سے پہلے ؞ زنجیر میں رکھا ہے معین مجھکو جکڑ کے مصحفی ؂ اس جذب کا بھی ہوں میں دوانا کہ ہا ئیلے ؞ نظروں میں میرے اشک کی تاثیر کھینچ لی جرأت ؂ دل وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنیکی ؞ دوانا ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی تنہا ؂ ہو ویگا کوئی لطف و عنایات کا دوانا ؞ تنہا ہے فقط آپ کی صورت کا دوانا

(۸) ڈھا جاتا ہے - یعنی گر جاتا ہے - مثلاً میر ؂

گردن ہوں ہر قدم پہ میں ڈھا جاتا ہے جی ہر دم   پہنچتا ہوں ترے در پہ کبھو سو اس خرابی سے

(۹) دیکھ رہتا ہوں - یعنی دیکھ کے رہ جاتا ہوں مثلاً میر ؂

لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں   دیکھ رہتا ہوں میں منہ سب کا

حرف "ر"

(۱) روونے - بجائے رونے مثلاً آبرو ؂

روونے سے عاشقوں کو شوق ہوتا ہے زیاد   عیش دونا ہوے ہے جو ابر نکلے تس اوپر زیاد

زیاد یعنی زیادہ - ہو ہے یعنی ہوتا ہے - تس بجائے کو -

حرف "ز"

(۱) زادہ - بجائے زیادہ مثلاً میر سوز ؂

عبث اس سے زیادہ کرنا کام ہے ایوب کا — یو خبر جلدی کر اب طاقت ہماری طاق ہے

(۲) زور سے زور سے بجائے زور زور۔ مثلاً انشا ؎

کل انکے پاؤں لگے دابنے تو یوں بولے — ہمارے سر کی قسم اور زور سے زور سے

حرف "س"

(۱) سجن بجائے معشوق۔ مثلاً ولی ؎

دل کو ہوتی ہے سجن بیتابی — زلف کوں ہاتھ لگایا نہ کرو

(۲) سناٹھا۔ بجائے سناٹا مثلاً میر ؎

بارے نسیم ضعف سے ہم نا تواں بھی — سناٹھے میں جی کے گلستاں سے گئے

(۳) سوں بجائے سے اسکا استعمال قدما کے یہاں عام ہے مثلاً ولی ؎

ولی تیرے لباں سوں اے شکر لب — چلا ہے لذت دشنام لیکر

(۴) سیتی بجائے "سے" یہ بھی قدما میں عام طور سے مستعمل ہے۔ مثلاً ولی ؎

کہتا ہے ولی دل سیتی یہ مصرع رنگین — ہے یاد تری مجکو سبب راحت جاں کا

حرف "ط و ع"

(۱) طرف ہونا۔ یعنی مقابل ہونا۔ مثلاً غالب ؎

رندان در میکدہ گستاخ ہیں ناصح — زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

(۲) عشق۔ یعنی سلام۔ مثلاً نثار مراد آبادی ؎

عشق ہے رنگ حنا کو کہ یہ کس شوخ کی ہے — بوسہ لیتا ہے ترے ہاتھ کی زیبائی کا

حرف "ک، گ"

(۱) کر بجائے کرکے۔ مثلاً ولی ؎

بجا ہے گر کہے کہ چمن میں نگاہ کر — نرگس کو اپنی چشم کا بیمار کر کے کہوں

نگاہ کر یعنی نگاہ کرکے۔

(۲) کرے بجائے کیجئے اور علی ہذالقیاس کرا۔ بجائے کیا۔ نواح علیگڈھ وغیرہ میں ع…
کی زبان پر اب تک جاری ہے۔ مثلاً میر ؎

جو ہم کو چاہیے یا دیریں بسر کریئے   تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریئے

(۴) کس اگے بجائے کس کے آگے مثلاً ولی ؎

اے ولی کس اگے کروں فریاد   ظلم کرتے ہیں ان بتوں کے نین

(۴) کنے یعنی پاس مثلاً میر ؎

چھپا لیتا ہے مجھسے چاند سا منہ وہ خدا جانے   سخن ساز اس کنے جا جا کے کیا اظہار کرتے ہیں

(۵) کوئی ۔ بجائے کوئی مثلاً ولی ؎

میں اسکو جون نگین کرتا ہوں ثبت   جو کوئی آتا ہے تیرا نام لیکر

ہوس ؎ خدا کیواسطے صاحب ذرا تم بام پر آؤ   سرِ رہ کوئی کھڑا ہے دیدکے امید وار کب کا

(۶) گی بجائے گئی مثلاً ولی ؎

تجھ لب کی پرستش میں گی عمر مری ساری   اے بت کبھی ہاری ٹک آس پچاتی جا

(۷) گونیا بجائے گویا مثلاً حسرت موہانی ؎

مضمون کی ہم غریبوں پہ نظر پڑتی ہے یوں   گونیا سر رشتۂ تقدیر دست زمین ہے

حرف "ل"

(۱) لاگا بجائے لگا ۔ مثلاً انشا ؎

ترانے کا جو پہنا اس پری نے تاشس کا جوڑا   تو اڑ لاگا فلک پر طائر رنتا یا شس کا جوڑا

(۲) لکھا ہوں ۔ بجائے "لکھا ہے" یعنی "حیدر آباد دکن میں یہ طرز بیان اسوقت تک گویا مروج ہے مثلاً ولی ؎ تصویر تری جان متقابہ لکھا ہوں ؛ یہ نقش پری دیدۂ مینا پہ لکھا ہوں

(۳) لگ چلنا مثلاً صبر ؎

گرچہ آوارہ جون صبا ہیں ہم   لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

آتش ؎ صبا کیطرح ہر اک غیرت گل سے ہیں لگ چلتے ؛ محبت سے سرشت اپنی ہمیں یارانہ آتا ہے

(۴) لوہو بجائے لہو مثلاً میر ؎

لوہو میں ڈوبے دیکھو دامان وجیب میر   پھرا ہے آج دیدۂ خونبار سے طرح

مصحفی ؎ گر شمع کے رونے میں ہو ایسی ہی رنگینی ؛ بھر جائیگا لوہو سے تا صبح لگن سارا

تنہا۔ گلشن میں وہیں کرنے لگا گرم خرامی — پھر کرنہ ہو دامن کو وہ لوہو سے کسی

حرفِ "م"

(۱) مارنے قابل بجائے مارنے کے قابل مثلاً امیر۔

حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتلِ نادان ورنہ — بے گنہ مارنے قابل یہ گنہگار نہ تھا

(۲) مجھ پاس بجائے میرے پاس۔ مثلاً محمد عیسٰی تنہا شاگرد مصحفی۔

کوچے میں اُسکے ہوکر مجھ پاس تو نہ آیا — میں تیری دوستی سے بادِ شمال

(۳) مجھ نام بجائے میرا نام مثلاً قائم چاندپوری۔

عار ہے ننگ کو مجھ نام سے اللہ اللہ — کام پہونچا ہے کہاں تک مری رسوائی کا

(۴) کس مرتبے میں بجائے کسقدر مثلاً میر۔

تحمل پیرہن نہ پاک کرین کیونکر نزاکت — کس مرتبے میں شوخ ہے اُسکی قبا

(۵) کلھڑا۔ بجائے مونہہ محبت اور پیار کے لہجے میں کبھی کبھی یہ لفظ اب بھی سننے میں آتا ہے

عالم تو نے کیا جلوہ گری کا عالم — کہ کبھو کا سادہ مکھڑا ہے پری کا عالم

(۶) ملا کے گیا بجائے ملا گیا۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو۔

نین سے نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا

(۷) میٹھے بجائے میں مثلاً ولی۔

بیوفا کر تجھکو بولوں ہوں بجا ہے نازنین — نازنین عالم جتنے ہوتے ہیں اکثر

(۸) میاں خطاب بہ معشوق مثلاً شاہ حاتم۔

جسکو چاہا ہو بھلا اُسکو برا کیا کہیے — گو کہ بد وضع ہے پر اپنا تو میاں

شاہ حاتم۔ ہمارے حق میں تو اک فتنہ بلا تو ہے — زہے نصیب میاں جسکا آشنا تو ہے

سوز۔ جس بت نے نظر بھرکے نہ دیکھا مجھے لیکے سوز — ہر چند کہا میں نے میاں بہر خدا

مصحفی۔ غیر وں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب — کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب

شاہ نصیر۔ منہ پہ بالوں کے بکھر نے سے نہ گھبراؤ میاں — نیچلے بیٹھو تو یہ اکدم میں سنور جاتے ہیں

قائم۔ کب تک تو جادوں بکھرے ہیں بال منتظر — اپنی ہی لیتے ہو میری بھی میاں سنو

حرف ن و ہ

(۱) نپٹ یعنی سخت کثرت کے معنی میں ۔ مثلاً میرؔ سے

بیتاب ہے دل غم سے نپٹ زار ہے عاشق — کیا جانئے کہ دو چار اس سے ہوتا جا رہے آخر

(۲) نہ باہ ۔ بجائے نباہ مثلاً میر سوزؔ سے

سوز دل دینے کی تو پوچھے اگر مجھ سے صلاح — ہے محبت کا مزا میٹھا ۔ ولے نہ باہ تلخ

(۳) نمن یعنی مانند ۔ مثلاً ولیؔ سے

وہ شمع بزم ادا بر ہے کر لباس زری — ہے آفتاب نمن شعلہ زار آتش حسن

(۴) نیں ۔ بجائے نہیں مثلاً سوداؔ سے

جوش میں میرے جنون کے کیا خوش آتی ہے بہار — پیرہن میں گل کے نیں پھولی سماتی ہے بہار

ولیؔ سے آب دیدے سوں دریا کے ہرگز کام نیں عشاق کو — گریۂ حسرت سوں ہے سرسبز باغ عاشقی

(۵) وَہ مثلاً میرؔ سے کہتا ہے کون تجھکو میاں یہ نہ کر تو وہ کر — پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل میں بھی جگہ کر

(۶) وے بجائے وہ جمع کی حالتیں وہ کی جگہ وے بولنا قدما کا عام دستور ہے مثلاً آبروؔ سے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے (دیوانے) کدھر گئے — وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

(۷) ورنہ بجائے یا ۔ دگرنہ بجائے ورنہ مثلاً مصحفیؔ سے

گر حصول مدعا ہو ورنہ ہو ہم شاد ہیں — وقف برق یاس سے خرمن یہاں ایجاد کا

فارسی میں اگر کے بجائے گر اور اسکے مقابل میں دگر اور ورنہ بھی لکھتے ہیں اردو میں متروک ہے۔
عرش لکھنوی سے کچھ اگلی ہمیں وہ آرزو ہو کے بیٹھے ہیں ۔ دگرنہ ایسی لڑائی تو لاکھ بار ہوئی
عیشی نے دگرنہ کے بجائے ورنہ استعمال تھا اور عرش نے ورنہ کی جگہ دگرنہ لکھا ہے یہاں مصرع کی
بجائے "نہیں تو" کے استعمال کا تھا ۔ عرش نے بظاہر "تو" کی تکرار کو بچایا ہے ۔

(۸) ہمسار یعنی ہمسے ۔ ہمارے مانند ۔ ہمارے ۔ اور ہمسری کے لئے اچھے آباد کی زبان پر اب بھی جاری ہے مثلاً مصحفیؔ سے

یاران عدم رفتہ گئے دور بہت سے — ہمسار کے پیچھے رہے رنجور بہت سے

(۹) ہمن کی یعنی ہماری مثلاً قائمؔ سے کاغذ ہوا زمین کا نہیں کہیا کہ شاید پہنچتا انہیں سے اسکو ہمن کی باتی (خط)

(۱۰) ہمیش - بجائے ہمیشہ مثلاً میر؎

ہمیشہ جور رکھتے ہو جور و جفا ہمیش
خوبی رہا کرے ہے مری جان کیا ہمیش

(۱۱) ہینگے - بجائے "ہیں" پرانے لوگ کبھی کبھی اب بھی ہیگا اور ہینگے بول جاتے ہیں مثلاً میر؎

قید حیات قید کوئی سخت ہے کہ روز
مرتے ہینگے ان کے گرفتار ایک دو

آبرو؎ سخن سنجان میں ہیگا آبرو آج
نہیں شیریں سخن ش کر کے مانند (شکر سری کا)

اُردو زبان کے الفاظ کی جمع "وں" کی جگہ "اں" سے

(۱) کھوان بجائے کھوؤں یا زلفاں بجائے زلفوں مثلاً ولی؎

آج تیری بھواں نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

تجھ زلفاں کا ہر تار سیہ ہے کال عاشق کا
ہوا ہے جس کے جلوے سوں پریشاں حال عاشق کا
(ولی)

مذکر الفاظ کی جمع "اں" سے

جن الفاظ کے آخر میں حروف علت میں سے کوئی حرف ہوتا ہے انکی جمع کا یہ مقررشدہ قاعدہ ہے کہ بحالت تذکیر "الف" یائے مجہول سے بدل جاتا ہے لیکن "و" اور "ی" میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی مثلاً لڑکا آیا اور لڑکے آئے۔ آنسو نکلا اور آنسو نکلے موتی ٹوٹا اور موتی ٹوٹے۔

بحالت تانیث البتہ "اں" لگاتے ہیں مثلاً لڑکی آئی۔ اور لڑکیاں آئیں۔ لیکن اس قاعدہ کے خلاف قدما اکثر مذکر الفاظ کی جمع میں بھی "اں" زیادہ کر دیتے تھے مثلاً - انشا؎

یہ کس سے چاندنی میں ہم بہ پیر آسمان لپٹے
کہ باہم عرش پر مارے خوشی کے قدسیاں لپٹے

یہ رواج حیدرآباد دکن میں اس وقت تک موجود ہے کہ وہاں "لوگ" کے بجائے "لوگاں" بھی عام طور پر بولا جاتا ہے۔

فصل دوم

متروکات معروف

متروکات معروف یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہد متوسط کے کلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً۔

(۱) آئیان، بہاریان وغیرہ

عموماً اسکی دو صورتیں پائی جاتی ہیں اول اسطور پر کہ جمع مؤنث کیساتھ صفت بھی بصورت جمع آتی ہے مثلاً "راتین کالیان" دوم اسطرح کہ جمع مؤنث کیساتھ فعل بھی بصورت جمع آتا ہے مثلاً "آنکھین ترستیان ہین"۔ آجکل یہ دونوں صورتیں متروک ہیں ذیل میں میر و مصحفی سے لیکر شوق لکھنوی و شاد عظیم آبادی تک کے کلام سے مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔ میر —

پڑھتے پھرینگے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مدت رہینگی یاد یہ باتین ہماریان

"مدت رہینگی یاد" یعنی "مدت تک یاد رہینگی" حرف تک کا حذف فارسی کا تتبع اور زبان دور قدیم کا خاص جوہر ہے۔

ولہ — گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے — دل سے گئیں نہ باتین تری پیاری پیاریان

یہان بھی "ہزار رنگ" بجائے "ہزار رنگ" مستعمل ہوا ہے اور حرف "سے" محذوف ہے۔

ولہ — تلوار غرق خون ہے آنکھین گلابیان ہیں — دیکھین تو تیری کب تک یہ بدشرابیان ہین

سودا — سے صورتین نجانے کس دیس بستیان ہیں — اب دیکھنے کو جنکے آنکھین ترستیان ہین

مصحفی — بے دیکھے جسکے پل میں آنکھین بھر آئیان ہون — کیا قہر ہے جو اُس سے برسون جدائیان ہون

ولہ — اس نازنین کی باتین کیا پیاری پیاریان ہیں — پلکین ہیں جسکی چھریان آنکھین کٹاریان ہیں

جرأت — یاد کر وہ حسن سبز اور انکھڑیان متوالیان — کاٹتے ہیں آہ رو رو ساون کی راتین کالیان

انشا — جس سے کہ چپکے چپکے لاگین لگائیان ہون — لازم ہے یہ کہ اس سے برسون رکھائیان ہون

تنہا — نے ملاقاتین ہیں وہ نے وہ نگاہیں لڑتیان — ہجر کی یہ آفتین کیا کہین ہمیں پر پڑتیان

ذکی مرادآبادی — جیتے دیکھین انکھڑیان متوالیان اُس شوخ کی — بلطف از خود رفتگی کا ہیں تمنائی نہیں

میر دہلوی ۔ شب غم میں مونس ہیں لاچاریاں　　ملیں خاک میں حسرتیں ساریاں
آتش ۔ عہد طفلی میں بھی تھا میں اسکے سودائی مزاج　　بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں
نواب مرزا شوق ۔ اور وہ ہوتیاں ہیں البیلی　　میں نہیں کچی گولیاں کھیلی
شاد عظیم آبادی ۔ پڑے کے محدین ہاں ولا ہیں گر ابو حشر تک ۔　　اسکے جفا کی سختیاں تو سے نہیں اٹھائیاں

آخری تین مثالوں کو داخل مستثنیات سمجھنا چاہیئے اسلیئے کہ اٹھائیاں اور بھاریاں وغیرہ الفاظ کا استعمال متاخرین کے نزدیک بھی مسلمہ طور پر متروک ہے۔

(۲) پیاسا باعلان "یا"

پیاسا اور اس قسم کے بعض اور الفاظ مثل پیارا اور دہیان وغیرہ میں اعلان "یا" بالاتفاق متروک ہے۔ مثلاً۔

میر ۔ ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تمکو　　تمسے بھی کوئی پوچھے تم کیون ہوئے پیارے

پہلے مصرع میں پیار کا تلفظ صحیح ہے۔ البتہ دوسرے مصرعے میں "ی" کا اعلان لفظ پیارے میں اب متروک ہے

سودا ۔ مارو گے کسکو جی سے کس پر کمر کسی ہے　　پھرتے ہو کیون پیارے تلوار ڈھال باندھے
ولی ۔ جب نظر اسکی آن پڑتی ہے　　زندگی تب دہیان پڑتی ہے
قائم چاندپوری ۔ بہار عمر ہے قائم کوئی دن　　اُسے چمن گل پیارے کاٹ ہنسکر
خواجہ وزیر ۔ زاہد حرام ہے کو نہ کہنا وگرنہ میں　　جنت میں چھین لونگا پیالا شراب کا
بیخود دہلوی ۔ پی بھی لے دو گھونٹ زاہد پی بھی لے　　میکدے سے تو پیاسا جائیگا
داغ ۔ یہ سمجھکر گالیاں دیتے ہیں وہ　　بھولی صورت پہ پیار آجائیگا

آخری تین مثالوں کو اتفاقی سمجھنا چاہیئے۔ انکی بنا پر متاخرین کے کلام میں اعلان "یا" کا جواز نہیں ثابت ہو سکتا۔

(۳) "تئیں" یا "کے تئیں"

"تئیں" بمعنی "تک" اور "تئیں" بمعنی "کو" دونوں متروک ہیں۔ البتہ "تئیں" بمعنی "خود کو" کم از کم بول چال میں کبھی کبھی ابتک استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً "معلوم نہیں وہ اپنے تئیں

کیا سمجھتا ہے" اس فقرے کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ "وہ معلوم نہیں آپکو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے" یہاں پر صرف "آپکو" کہنے میں چونکہ مفہوم مشتبہ ہو سکتا ہے لہٰذا اُسکے بجائے "اپنے تئیں" کا جواز بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

میر ۔ شب میکدے سے وارد مسجد ہوا تھا میر
پر شکر ہے کہ صبح تئیں بے خبر رہا

ولی ۔ افسوس ہے کہ منتظر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے ترے تئیں یکبار دیکھ کر

درد ۔ درد تو کرتا ہے معنی کے تئیں صورت پذیر
دسترس رکھتے ہیں کب بہزاد و مانی اسقدر

مجذوب ۔ بی کو جو کہہ کے سمجھو جانتے ہیں
اپنے تئیں کو یار وہم خوب جانتے ہیں

یہاں "تئیں" اور "کو" دونوں موجود ہیں۔ اسکو از قبیل شاذ سمجھنا چاہیئے۔

قائم ۔ اے نزع پھر قریب ہے شام شب فراق
یہ مرحلہ تو اب تئیں یکسو نہیں ہوا

منشی غالب ۔ جسطرح وہ عشاق کے تئیں مار رکھے ہے، شوخی سے تغافل سے ترحم سے غضب سے
محمد علیشاہ تنہا ۔ کوچے میں لگا جانے جو اُس شوخ کے تنہا، دانستہ میں اپنے تئیں مجذوب بنایا

(۴) ٹک و تنک

ٹک و تنک بمعنی ذرا بالاتفاق متروک سمجھا جاتا ہے۔

میر ۔ ٹک بھی نہ مڑ کے میری طرف تو نے کی نگاہ
اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا

ولی ۔ بات میں غیروں کو چپ کر دوں ولیکن کیا کروں، وہ سخن گستر تنک میرا کہا کرتا نہیں

میر وزیر ۔ دشوار ہوئی ظالم تجھکو بھی نیند آئی
لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی

میر سوز ۔ ہے چال یا قیامت ہے حسن یا ترا را
چلتا ہے کس ادا سے ٹک دیکھیو خدا را

مرزا جعفری حشمت ۔ مجھے ٹک سانس بھی یہ درد و غم لینے نہیں دیتا، عجب کچھ درد ہے دل میں کہ دم لینے نہیں دیتا

قائم ۔ عذر تقصیر بھی چاہونگا میں اُس سے اے دل
ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کبھی

مصحفی ۔ بھڑکی ہے تب عشق کی دل میں غضب آتش
دے گر یہ چھڑک آب کہ ٹک جائے دب آتش

جرأت ۔ ہے مشکل جو ملیں اُس بت مغرور سے ہم
دوسرے تیسرے دیکھ آتے ہیں ٹک دور سے ہم

ہوس ۔ جب ٹک دیکھا تو آنکھیں نیچی کر لیں شرم سے، دیکھیو پھر اسطرف کیونکر شرماتے نہیں

تنہا ۔ ہاتھ میں ٹک تھامن کو اٹھا یہ بھی ہر کوئی چلنے کی ادا، خاک اسکی تو پو بربادہ دیو راہ میں تیری خاک کا

شاہ نصیر ــ انصاف تو کرو لمیں ٹک اے ساقی کم ظرف ؛ خالی کوئی دیتا ہے بھلا جام کسیکو
انشاء ــ اترتی نجد میں کب تھی سواری لیلیٰ — ٹک آہ قیس کے جذب اثر سے اتری ہے
فراسو ــ چبتا ہے کیا ہی مجھکو اے یار مسکرانا — ٹک واسطے خدا کے یکبار مسکرانا
معروف ــ معروف اتنو دیکھتے ہو تم ہیں غریب — ٹک یار منھ لگائے تو پھر ہمکو دیکھیے
لاعلم ــ او دامن اٹھا کے جانے والے — ٹک ہمکو بھی خاک سے اٹھا لے

ان سب مثالون پر نظر کرنے سے معلوم ہو گا کہ ٹک کا استعمال متروک ضرور ہے لیکن ناگوار نہیں خصوصاً متقدمین کے کلام میں۔

(۵) "جائے" بمعنی "جگہ"

جائے بمعنی جگہ مومن و غالب بلکہ شاگردان غالب کے وقت تک جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب بالاتفاق متروک ہے اگرچہ بات چیت میں اہل دہلی اب بھی کبھی کبھی بول جاتے ہیں۔
مومن ــ کردیے اپنے آنے جانے کے — تذکرے جائے جائے لوگون نے
ذوق ــ سر بوقت ذبح اس قاتل کے زیر پا ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
زکی دہلوی شاگرد غالب ــ تا دم مرگ تھی دیکھی ہر سال گرہ ؛ رشتہ عمر بہت جائے سے ٹوٹا نکلا

(۶) حذف "نے" علامت فاعل

"نے" علامت فاعل کا حذف قدیم شاگردان مصحفی کے وقت تک عموماً جائز سمجھا جاتا تھا بعد میں متروک قرار پایا حتیٰ کہ مصحفی کے آخری شاگردون مثل آتش و اسیر کے کلام میں بھی اسکی مثال کہیں نہیں ملتی۔ یہ سب اصلاح زبان کے باب میں شیخ ناسخ کے ہمعصر اور متبع تھے۔
قائم ــ مین خوب ہی جہان دیکھے اور جہان دیکھا ؛ پر آشنا کوئی دیکھا نہ مہربان دیکھا
ولی ــ عوض طریق گزشتون کا ہمنے غم کھینچا — شراب اورون نے پی اور خمار ہم کھینچا
مومن ــ ہر ایک دل و جان کے مرغوب نظر آئے — مین خوب تمہین دیکھا تم خوب نظر آئے
مصحفی ــ اک ذرا دیکھو اُس رشک پری کا سنو — مین تو دیکھا نہیں اس نجری کا سونا
جرأت ــ نہ جواب لیکے قاصد پھر اشتاب لٹا — مین زمین پہ ہاتھ مارا بصد اضطراب آگا
محمود شاگرد مصحفی ــ ساقی جو لایا شیشہ اُسے فرط شوق سے ؛ مین اپنے دونون ہاتھون کو ساغر بنا لیا

سرور شاگرد مصحفی ؎ دو چار گھڑی دن سے جو رخصت میں طلب کی ؛؛ تو چلئے کہا جائیے بس رات نہ کیجے

نہال شاگرد مصحفی ؎ میں سوتا اسکو پا یا تھا پلنگ مارت سو کیا کہیئے ؛؛ مری پانون کی آہٹ سی وہ بیدار ہو اٹھ بیٹھا

(۷) "رہوے" بجائے "رہے"

صرف رہوے بجائے رہے بالاتفاق متروک ہے حالانکہ اسی قسم کے بعض دیگر الفاظ مثل لیوے دیوے وغیرہ کو راقم حروف از قبیل متروکات جائز سمجھتا ہے جنکا بیان فصل سوم میں آئیگا۔

مخمور ؎ مخمور ہے دعا ہے مستوں کا دل خنک ہے ؛؛ کی صراحی برف میں رہوے صدا انکی

(۸) زور

زور بمعنی عجیب وخوب وکثیر میر سے لیکر ناسخ بلکہ شاگردان ناسخ مثل بحر وزبیر وسحر تک کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اسپر بھی آجکل اسکے متروک ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

میر ؎ میں نے جو بیکسانہ مجلس میں جان کھوئی ؛؛ سرپر مرے کھڑی ہو شب شمع زور روئی

ولا ؎ آلودہ خون سے ناخن ہیں شیر کے سے ہرسو ؛؛ جنگل میں چل بنے تو پھولا ہے زور ڈھاکا

درد ؎ درد ہرچند کہ ظاہر میں ہوں اک مو ضعیف ؛؛ زور نسبت ہے دلے مجھکو سلیمان کے ساتھ

سودا ؎ اٹھ جانے میں ہے زور مزا یار سے لڑکر ؛؛ ملتے ہیں تو پھر چھاتی سے چھاتی کو رگڑ کر

مصحفی ؎ اس چشم کی گردش تو مجھے لے سی گئی تھی ؛؛ پر مصحفی اپنے تئیں میں زور سنبھالا

جرأت ؎ بزم طرب میں شکل دکھا کر چلے گئے ؛؛ شادی میں غم پہ زور لگا کر چلے گئے

ولہ ؎ یار کا آستان پایا ہے ؛؛ زور دل نے مکان پایا ہے

ہوش ؎ تیرے کشتے نے نہیں زور چمن دکھلایا ؛؛ عرق خوناب ہر اک تار کفن دکھلایا

تنہا ؎ کل اس مطرب پسر نے بزم میں کی زور بیدستی ؛؛ لڑا مردنگ کو شیشے سے اور مردنگ سے شیشہ

مسرور کاکوروی ؎ کہتے ہیں درگوش ترا دیکھ کر بجلی ؛؛ یہ زور ستارا مہتاباں کے تلے ہے

ولہ ؎ خط زور تماشے کا لکھا یار نے مسرور ؛؛ مطلب نہیں مطلق فقط آداب بھرا ہے

ولہ ؎ بلبل نے کہا مسکے مرا شور چمن میں ؛؛ یہ نالہ کش آیا ہے کوئی زور چمن میں

راسخ عظیم آبادی ؎ انکار ہے اسکا لذت آمیز ؛؛ ہے زور مزا نہیں نہیں میں

ملک الشعرا اختر ؎ مے پینے سے لے شوخ نگار شفقی رنگ ؛؛ ہے رخ پہ ترے زور بہار شفقی رنگ

انشاؔ ؎ خم بغل بیچ نہاں ہاتھ میں ہر جام لیے ۔ ساقی آتا ہے چلا زَوْرِ سرانجام لیے

انشاؔ نے یہاں سرانجام بمعنی سامان استعمال کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

زکیؔ مرادآبادی ؎ بھیگے بالوں کو جو ہاتھوں سے نچوڑا اٹھنے ۔ شعلۂ رنگ حنا زوَرِ دھواں دھار ہوا

ناسخؔ ؎ زور ہے گرمیٔ بازار ترے کوچے میں ۔ جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

داغؔ ؎ نقد دل دیتے ہیں اک محبوب بازاری کو آج ۔ زورِ سودا مول لیتے ہیں سر بازار ہم

داغؔ ؎ خود ہنستے ہو اغیار سے ہنسواتے ہو مجھکو ۔ یہ زورِ ہنسی ہے کہ رُلا جاتے ہو مجھکو

خواجہ وزیرؔ ؎ یہ زورِ آتش رنگ حنائے گرمی کی ۔ تری ہتھیلی کا تل صورت سپند ہوا

داغؔ ؎ ہاتھ میں سلسلۂ زلف گرہ گیر نہیں ۔ زورِ دیوانہ ہوں میں بستۂ زنجیر نہیں

سحرؔ لکھنوی ؎ ایک ہی بھر دیا ہے دل بھی کوئی زور ہے ۔ بزم میں سر دچراغاں تھے چمن میں ہو رہے

(۹) سوا بجائے دو کے "سوا"

ہوسؔ ؎ دل اسکے در سوا نہیں لگتا کہیں ذرا ۔ فرصت دے ناتوانی تو جا دیں وہیں ذرا

داغؔ ؎ یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشین نہیں کھاتی ادب سے خدا کی قسم ۔ تم قیس سوا مجھے کچھ نہیں غم اسی کشتۂ ناز و ادا کی قسم

مخمورؔ ؎ میری قسمت میں نہیں مخمور مینو شی سوا ۔ خط ساغر جانتا ہوں میں خط تقدیر کو

(۱۰) عنایات۔ آفات وغیرہ بجائے عنایت و آفت

سوداؔ ؎ یار وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا ۔ نظروں میں سو طرح کی حکایات ہو گئی

میر حسنؔ ؎ وہ چشم لطف اور وہ عنایات کیا ہوئی ۔ وہ غمزہ وہ ادا وہ اشارات کیا ہوئی

داغؔ ؎ ہنستے ہی ہنستے روٹھ گیا ہم سے وہ صنم ۔ یہ اور دلپہ یک بیک آفات ہو گئی

داغؔ ؎ یہ گفتگو کبھی بھی نہ آئی تھی درمیان ۔ جو کچھ کہ تو نے حرف و حکایات آج کی

مغ کے بجائے مغاں کا استعمال بھی ازیں قبیل سے ہے۔ مثلاً

حالیؔ ؎ آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا ۔ ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا

مجروحؔ ؎ کیا مغاں بھی ہے پیر کا پُتلا ۔ مے پیا ہے پلائے جاتا ہے

حالیؔ کے شعر میں ممکن ہے کہ مغاں بطور واحد نہ استعمال نہ کیا گیا ہو مگر اس صورت میں مغاں کے بجائے بقاعدہ اردو مغوں چاہیے تھا کہ مغاں۔

(۱۱) کسو۔ کبھو

یہ دونوں لفظ لکھنؤ میں ناسخ کے عہد سے متروک ہیں۔ دہلی میں غالب ذوق و مومن کے وقت تک انکا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا اب ان بھی متروک ہیں مرزا غالب نے اس باب میں اپنا مسلک ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ "قافیہ کی رعایت سے اگر کیا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح کسی ہے" حضرت نظم طباطبائی کے نزدیک اب یہ طے ہوا سمجھنا چاہیئے کہ قافیہ کی ضرورت سے بھی ان لفظوں کا باندھنا صحیح نہیں"۔ راقم حروف کے خیال میں شعرائے اردو کو عام طور پر حضرت نظم کے قول پر عمل کرنا چاہیئے۔ البتہ شاذ مواقع پر کہنہ مشق اساتذہ کے لیئے مرزا غالب کی پیروی بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتی۔

میر تقی میر ۔ دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

" ۔ ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کیساتھ
لیجاتے دلکو خاک میں اس آرزو کیساتھ

قائم ۔ یارب وہ دن نصیب بھی ہوگا کبھو مجھے
مدت سے اسکے وصل کی ہے آرزو مجھے

مصحفی ۔ خطرا ہے مجھے اس دل کمبخت کی خو سے
ڈرتا ہوں کہ ہو جائے محبت نہ کسو سے

" ۔ رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اُسے میں پہ کبھو کا نکلا

تنہا ۔ یوں گلبدن ہزاروں ہیں تنہا پہ کیا کریں
پاتے نہیں ہیں بوئے محبت کسو میں ہم

شاہ نصیر ۔ لوگ کہتے ہی رہے جس پہ وہ شمع رو نہ آیا
جلنے تری شرارت یا تنک کبھو نہ آیا

ظفر ۔ شکایت ہمیں غمازیا عدو سے نہیں
گلہ ہے دوست سے اپنے فقط کسو سے نہیں

ذوق ۔ مرنے جو موت کے عاشق بیان کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

مومن ۔ عشق سے پہلی فاقہ دم کم کبھو نہ آیا
جبتک صبا کا جھونکا لے تیری بو نہ آیا

غالب ۔ کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیجو صلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

تنویر ۔ دوست سے خواہ وہ عدو سے ملے
جب نہیں ہم تو وہ کسو سے ملے

" ۔ انھیں باتوں سے اسکی خو بگڑی
کبھو ہم سے بنی کبھو بگڑی

فراق ایلوی ۔ زبان پہ آہ رہی لب پہ کبھو نہ ملا
تری طلب تو ملی کیا ہوا جو تو نہ ملا

حسرت موہانی ۔ باقی ہے جو کچھ کچھ خلش درد کبھو کی
ابتک یہ مرے دل میں امانت ہے کسو کی

حسرت موہانی ۔ مقصد ہے جلانا کبھی اسکو کبھی مجکو ۔ خاطر تجھے منظور ہے میری نہ عدو کی

(۱۳۵) نت بمعنی ہمیشہ

میر ۔ نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا ۔ اُس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا
سودا ۔ سودا یہ کیا کریگا نت اسقدر کا رونا ۔ عالم کو اے دوانے مت ساتھ لے ڈبونا
؍ ۔ غیر پہ نت ہے کرم ہم پہ ستم واہ واہ ۔ دیکھ لیا بس تمہیں ہمنے صنم واہ واہ
مصحفی ۔ کیا اپنی ہی کہتے ہو نت ، اس شوخ سے یارو ؛ میرا بھی کہیں ذکر ملاقات چلاؤ
تنہا ۔ بیتاب یوں ہے اس دل بیتاب کی ہی نت ؛ داماں بتنگ ، جیب بجان ، آستیں خفا

(۱۳۶) دیا بجائے یا

یا کے بجائے دیا ۔ بالاتفاق متروک ہے ۔ اگرچہ شعرائے لکھنؤ نے خواجہ وزیر اور مرزا محمد بیگ عاشق تک کہیں کہیں اسکو استعمال کیا ہے ۔ مثلاً

خواجہ وزیر ۔ نہ آؤ خوش رہو سمجھا ہیو مرے صفا ۔ ملو دیا نہ ملو ہم نباہ کرتے ہیں
عاشق لکھنوی ۔ نشہ میں تم بہکتے ہو خبر اتنی نہیں کہتو ۔ کہ آتا ہے کوئی اپنا دیا بیگانہ آتا ہے

(۱۳۷) وہ ہیں ۔ وہ ہی ۔ یہ ہی

وہ ہیں ۔ وہ ہی ۔ یہ ہی کے بجائے اب وہیں اور وہی ۔ یہی کا استعمال بالاتفاق صحیح سمجھا جاتا ہے ۔ اگرچہ دہلی میں مومن ، غالب اور مرزا صابر اور لکھنؤ میں دو ایک جگہ شیخ ناسخ تک وہ ہی لکھ گئے ہیں ؛ ۔

میر ۔ وہ میگسار ظرف جنھیں میکشی کے تھے ۔ بھر کر نگاہ تو نے جو کی وہ ہیں جھک گئے
جعفر علی حسرت ۔ نہ وہ ہی آتا ہے اسطرف کو ادھر نہ اپنا گذار ہے ؛ بھلا ہی پھر کون ڈھب کہ صحبت ہماری اسکی برار ہووے
مصحفی ۔ نہ اُٹھا حشر کو بھی اسکی تیغ ناز کا مارا ۔ کیا خوں اسنے اک عالم کا اور وہ ہیں چھپا ڈالا
؍ ۔ آیا جو یاں سو وہ ہیں بہانے سے اُٹھ گیا ۔ آسودگی کا حرف زمانے سے اُٹھ گیا
تنہا ۔ کبھو اس پری نے منھ سے جو سر نقاب اُلٹا ۔ مرا دل بھی منھ کو وہ ہیں بصد اضطراب الٹا
؍ ۔ اللہ رے عداوت کی اُسنے وہ ہی خفگی ہے ۔ جس بات سے کہ اپنے دلپر ملال گذرا
مومن ۔ دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش ۔ وہ ہی خط اُسنے بھیجدیا کیوں جواب میں

غالب ؎ صرفِ بہارے ہوئے آلاتِ میکشی | تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
ناسخ ؎ ہر صبح وہ ہی صبح ہے ہر شام وہ ہی شام | انسان پر ہے ذور فقط انقلاب کا
صابر ؎ وہ ہی کہیں نہ دل ہو کہ پہلو میں رشک مہر :: ذرہ سا اک چمکتا ہے گرد ملال میں

(۱۵) اُس ہی - ہم ہی - تم ہی - بجائے اُسی - ہمیں - تمہیں

وہ ہی اور یہ ہی کیطرح اُس ہی - ہم ہی - تم ہی وغیرہ کا استعمال بھی آجکل عموماً متروک سمجھا جاتا ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہی میں وہ کی ہائے ہوز کا اجتماع ہی کی ہائے ہوز کیساتھ اُس ہی سے بھی بڑھکر ثقیل ہے - بالفاظ دیگر اُس ہی وہ ہی سے کم اور تم ہی - ہم ہی سے بھی کم ثقیل ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ متاخرین کے کلام میں اسوقت تک ہم ہی اور تم ہی کا استعمال کچھ زیادہ برا نہیں معلوم ہوتا - مثلاً ؎

غالب ؎ دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا :: ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن
سائل دہلوی ؎ مجھ میں اور غیر میں انصاف سے کہدو تم ہی - الخ

اب ہم ہی کے مقابلے میں اُس ہی کو دیکھئے کہ متوسطین کے کلام میں بھی اسکا وجود ناگوار معلوم ہوتا ہے - مثلاً

میر حسن ؎ شب چاندنی میں مگر کسکا دیکھتا تھا :: مہتاب کا بھی دیدہ اُس ہی کو تک رہا تھا

بہر حال "اسی کو" کے مقابلے میں "اُس ہی کو" یقیناً متروک ہے - اگر ہم اسکو ابھی متروک نہ سمجھیں تو ایک بہت بڑی خرابی یہ لازم آتی ہے کہ اہل پنجاب کے بعض مکروہ فقرے مثل "اسکو ہی" "اُسنے ہی" وغیرہ بھی صحیح ٹھہرتے ہیں اسلئے کہ "اس کو ہی" اور "اس ہی کو" میں کچھ بہت فرق نہیں ہے - جو لوگ "اُس ہی نے" بول سکتے ہیں وہ "اُسنے ہی" ضرور بولیں گے - لیکن جو لوگ "اُس ہی نے" کے بجائے "اُسی نے" بولتے ہیں - اُنکے منہ سے "اُسنے ہی" ہرگز نہیں نکل سکتا -

(۱۶) پر - وپہ بجائے لیکن

جرأت ؎ میرے اور اسکے جو پوچھو پر بگڑ گیا کیا کچھ تھا | پر دل اُسکا پھر گیا ایسا کہ گویا کچھ نہ تھا
" ؎ یوں روٹھکر تو بیٹھا تھا پہ جیت نہ سکا دل | سر پاؤں سے پھر اُسکے میں نا چار لگا یا

بے نظیر — وہ اپنی جانفشانیاں ساری بھولیے ٭ سب بھول لیئے پہ یاد ہماری نہ بھولیے

قائم — تجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں ٭ یہ یوں تو زلف یار بھی پر اس قدر نہیں

” — طرازِ کلک قضا اور بھی تو ہیں مشہور ٭ پہ تجھ سا صفحۂ ہستی پہ نقش کم کھینچا

مذاق بدایونی — روتے ہیں پر نہیں معلوم سبب رونے کا ٭ پہ گیا دل کو مزا ہائے غضب رونے کا

شیفتہ — وحشت تھی مجھکو پہلے بھی پر یہ طپش نہ تھی ٭ شورش تھی مجھ میں پہلے بھی پر یہ مزا نہ تھا

میر حسین تسکین — تیغ نگاہ یار اچٹتی لگی تھی پہ ٭ برسوں گذر گئے مجھے آزار کھینچے

غالب — عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام ٭ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

” — غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے ٭ غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اسیر — ملے ہیں خاک میں پر ہے اسیر اپنی وہی طینت ٭ ہوا ئے خاکساری ہیں پریشاں خاکساری گئے

سحر لکھنوی — یار کے دل کی صفائی ہے کدورت کا سبب ٭ بات کیسی ہو چھپانے کی مگر چھپتی نہیں

اس شعر میں موقع مگر کی جگہ پہ کے استعمال کا تھا۔ غالباً سحر نے پہ کو متروک سمجھکر استعمال نہیں کیا۔ مصرعہ ثانی عبارت کیسی ہی چھپانے کی ہو پہ چھپتی نہیں - ہوتا تو یقیناً بہتر ہوتا - راقم حروف کے نزدیک ضرورت کے وقت پہ کا استعمال بلا شبہ جائز ہے۔

سحر لکھنوی — پاس ہوتا ہے مرے پہ نظر آتا نہیں ٭ کیا زمانا ہے کہ صحبت کا اثر جاتا رہا

لطافت — مدتیں گذریں پہ ہے عشق کا چرچا اب تک ٭ قیس و فرہاد نہ مانے ہیں رسوا اب تک

حشمت مدہانی — میں چاہتا تو بہت ہوں کہ بیٹھ رہوں خاموش ٭ پہ حیف خاطر بیصبر تاب سہنے دے

(۱۶) اک ذرا

مصحفی — اک ذرا دیکھیو اس رشک پری کا سونا ٭ میں تو دیکھا نہیں اس بیخبری کا سونا

ذکی — اک ذرا تیغ نگہ کو جو اشارا ہو جائے ٭ نام ہو جائیگا اور کام ہمارا ہو جائے

فصل سوم

متروکات جائزہ

یعنی شعرا ئے دور آخر و عہد حاضر کے وہ متروکات جنکے ترک کو راقم حروف جائز سمجھتا ہے مثلاً —

(١) اس پاس ۔ اس کنے

اس پاس بجائے اسکے پاس بالاتفاق متروک ہے البتہ اسمائے معرفہ کیساتھ صرف "پاس" کا استعمال کبھی کہیں کہیں برا نہیں معلوم ہوتا مثلاً

غالب ۔ تھا تیغ زن ایک خسرو پاس ۔۔۔ رنگ کا زرد پر کمان ہو پاس

شاہ حاتم ۔ دل تو تم پاس ہی گو محفل میں ۔۔۔ دور بیٹھے ہیں پرے بیٹھے ہیں

جرأت ۔ میں ہی رہتا ہوں اس پاس جو محفل میں تو وہ ؛ پاس کسی کے تئیں جلدی سے بلا لیتا ہے

ناسخ ۔ جلتے ہیں معشوق جاتے ہیں جو عاشق اس پاس ؛ کیوں نہ محفل میں جلاتے شمع پروانہ شمع

(٢) آن کے بجائے آ کے

ذوق ۔ اتنی تجھیں کیا باقی ہے جو ٹھہری جو تو آن کے پاس ؛ بدگمان وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

آباد لکھنوی ۔ احسان میرے سر پہ کیا ہے ضعف نے ؛ کوئے صنم میں آن کے میں ناتوان گرا

حسرت موہانی ۔ اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب ؛ آن پہنچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب

(٣) آئے ہے ۔ جائے ہے بجائے آتا ہے ۔ جاتا ہے

آئے ہے اور جائے ہے نواح دہلی مثل میرٹھ بلند شہر علیگڈھ میں آج تک عوام کی زبان پر جاری ہے مگر تحریر و نظم میں اب لکھنؤ کے مانند دہلی میں بھی یہ الفاظ بالاتفاق متروک سمجھے جاتے ہیں۔ راقم حروف کے نزدیک بھی اس قسم کے الفاظ کا ترک جائز ہے لیکن ضرورت شاعری کے خاص موقعوں پر بشرط مذاقی کمال انکے استعمال میں بھی کچھ مضائقہ نہ ہونا چاہئے مثلاً

مرزا تسلیم دہلوی کا ایک مصرعہ ہے "رحم آجاتا ہے دشمن کی گرفتاری پر"

مرزا صاحب بھی اگر زبان لکھنؤ کی پابندی سے آزاد ہو کر "رحم آجاتا ہے" کی جگہ "رحم آجائے ہے" لکھتے تو کچھ حرج نہ ہوتا بلکہ غالباً بہتر ہوتا۔ یہی حال بیخود دہلوی شاگرد داغ کے اس مطلع کا ہے

کوئی چل جاتا ہے جب تیر نظر تیر کیساتھ ۔۔۔ خود تڑپ جاتا ہے صیاد بھی نخچیر کیساتھ

اب متقدمین سے لیکر متوسطین و متاخرین و شعرائے دور حاضر کے کلام میں اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں

سودا ۔ گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ۔۔۔ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

" ۔ پیمانہ بہ سیر جام بہ یاد گزرے ہے ۔۔۔ نسیم تیری چھاتی کے پار گزرے ہے

حسرت استاد جرات ۔ کہ بیٹھے بُرا منہ سے بھلا اور بھی کچھ ہو ۔ دشنام دے جانو ہو یا اور بھی کچھ ہے
قائم ۔ پل مارنے کرے ہے اشاروں سے ستم ۔ تکا اُس ستم ظریف کا بہتان دیکھنا۔
حسن ۔ کیا جانیئے کس طرح سے وہ شوخ ملے ہیں   کچھ اسکی ملاقات کا پاتے نہیں ڈھب ہم
مصحفی ۔ اے مصحفی مُن اسکا جو دیکھے ہے کہے ہے ۔ یہ طرفہ ستارا فلک ناز پہ نکلا
رنگین ۔ دل لیگیا ہے میرا وہ سینہ چرا کر   شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر
جرات ۔ کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ جی ۔ یوں اور کیا جہاں میں کوئی حسین نہیں
مشہور کاکوروی ۔ کیا جمع خاطری سے سنوارا ہو ہو زلف کو ۔ دیکھو ادھر جہان پریشان تو ہو چکا
تنہا شاگرد مصحفی ۔ ہر چند وہ بھی جانے ہے یہ طور کچھ نہیں ۔ اک ضد سی پڑ گئی ہے اُسے اور کچھ نہیں
شہیدی ۔ غصے میں تیا رنگ نکالیں ہیں پری رو ۔ جوں جوں یہ بگڑتے ہیں سنور جاتے ہیں کیسے
میر شیون ۔ کون آئے ہے کہ سینے میں بیدار ہو گئی ۔ صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کیساتھ
ذکی مراد آبادی ۔ ذکی میرے دل عشق کو مثل طائر رنگ ۔ ہوائے شوق لیے جائے ہے اڑائے ہے
مذاق بدایونی ۔ جسطرح کہ مینہ برسے ہے تاثیر ہوا سے ۔ برسے ہیں مری آہ کی تاثیر سے آنسو
غالب ۔ مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال ۔ تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
شیفتہ ۔ کیا اٹھ گیا ہے دیدۂ اغیار سے حجاب ۔ ٹپکا پڑے ہے کیوں نگہ یار سے حجاب
حسین تسکین ۔ اب یہ حالت ہے کہ تجھسا بیدرد ۔ میرے بچنے کی دعا مانگے ہے
شاکر میرٹھی ۔ دو تیغ کف خاکستر جنت تن خام ۔ ڈھونڈھے ہے دل بے بال و پرا
بنواری لال شعلہ ۔ برسے ہے لہو تیغ ابرو کی ادا میں ۔ خنجر کو ڈبو دیجے خون شہدا میں
عاشق دہلوی ۔ تا نہ ہوا انداز ہوا یا ہوا ادا   ٹپکے ہے شوخی تری ہر آن سے
اسمٰعیل میرٹھی ۔ اگر جانو ہو تم بیہودہ گو گلہ   تو چروا ہا بھی راضی اور شبان ہے
حسرت موہانی ۔ کاہیدہ عیش بیچید ہیں دل عشرت نصیب ۔ آرزو کے سر سے گذرا جائے ہے اب

(۴) اور کی بجائے اور بہی یہاں بھی بجائے ساتھ ہی

اور بہی کے بجائے اوری لکھنا لکھنؤ کے بعض شعرائے عہد متوسط خصوصا شاگرد
ناسخ کیساتھ مخصوص تھا ۔ مثلاً

رشک لکھنوی ؎ کرے عاشق جو فرمائش تو اودی راگ لاتے ہیں ؛ پپیہے کی لینے لگتے ہیں گانے میں بجانے میں

؎ مضمون تازہ بہر تسلی دل یہ ہے | لکھتا ہوں خط شوق کے ساتھ ہی جواب بھی

مہر لکھنوی ؎ رنگ اور ہی اے بہار اک دن یہاں ہو جائیگا ؛ گلشن ایجاد پامال خزاں ہو جائیگا

(۵) الفاظ فارسی مثل ناگوار - گزارہ - یاد - فرصت - محنت وغیرہ

غالب ؎ دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ؛ بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

ناظم ؎ ایک یہ بھی ڈھنگ ہے بہر دفع چشم زخم ؛ اپنی آرائش نہیں ہے آنکو زیور سے غرض

یہاں غرض بمعنی مطلوب استعمال کیا گیا ہے - ایسے موقعوں پر حرف ہے یا کی عموماً محذوف ہو جایا کرتا ہے مثلاً

؎ غالب ہے مجھکو اس سے وفاداری آرزو - یعنی وفاداری کی آرزو -

مجروح ؎ دل بے صبر میں ہے غم کا گزارہ | گر گئی اس مکان کی دیوار

اشرف گسنڈوی ؎ لطف آواز ہم آواز سے ہوتا ہے زیادہ ؛ ہم بھی فریاد کریں نالۂ زنجیر کے ساتھ

حسرت موہانی ؎ ناگوار ہے بہت تلخی ہجران لیکن ؛ تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی

؎ غمزۂ دلفریب کو اور بھی جانفزا بنا | پیکر ناز حسن پر رنگ حیا نہ یاد کر

؎ خواب اک شب مرا جو یار ہوا | اک عجب شہر میں گزارہ ہوا

؎ ہر چند کہ بیتابی ہے لازمۂ محنت | ہم چپ ہیں کہ ایسا ہی فرمان محبت ہے

نشان زدہ کل الفاظ فہرست متروکات جائزہ میں داخل ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خاص موقعوں پر بشرط کہنہ مشقی و بطور شاذ انکا استعمال ممنوع نہیں لیکن عموماً انکا ترک ہی اولیٰ ہے -

(۶) بلے بمعنی اللہ رے

جرأت ؎ بیتاب ہو لگ چلنے کا میں نے جو کیا قصد ۔ دے بیٹھا وہ گالی

کچھ اور کیا قصد تو کس ناز سے بولا - بلے تری جرأت

منیر شکوہ آبادی ؎ بلے شوخی کہ مری لاش کو ٹھکرا کے کہا ؛ بول اٹھئے جو رہے کشتۂ رفتار ہیں آپ

خواجہ عزیز ؎ واہ ری تاثیر الفت بلے فرط اتحاد ؛ غش پہ غش آتے ہیں مجھکو جب اسکو غش آتی ہے نیند

تنویر دہلوی ~ دیا جام جب غیر ہی کو دیا　　نشے میں تری بلبلے ہشیار یاں

(۷) پرے یعنی دور یا علیحدہ

پرے دہلی کی زبان ہے۔ لیکن کہیں کہیں مرزا کلب حسین خان نادرؔ شاگرد ناسخؔ دہلوی نے بھی اسکو نظم کیا ہے مثلاً

مومنؔ ~ چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ　　اے شب ہجر تیرا کالا منہ
نادرؔ ~ اُن سے وصال ہو کسی صورت نہیں یقین　　جب پاس ہم گئے تو وہ ہم سے پرے رہے

(۸) پنے بجائے پن

بعض لوگ پن کو صرف ہندی الفاظ کے ساتھ ملانا صحیح سمجھتے ہیں۔ مثلاً لڑکپن بچپن وغیرہ اور اسکو فارسی الفاظ کیساتھ لانے سے احتراز کرتے ہیں یہانتک کہ نازک پن دیوانہ پن کو بھی غیر فصیح قرار دیتے ہیں راقم کے نزدیک اردو زبان کے دائرے کو اسدرجہ محدود کرنا کسیطرح مناسب نہیں ہے تاہم اس باب میں حد سے بڑھنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً یہ جو بعض شعرائے لکھنؤ نے پن کے بجائے فارسی الفاظ کیساتھ پنے کا استعمال بھی جائز رکھا ہے اُسکی تائید نہیں کیجا سکتی۔

ماہرؔ لکھنوی ~ آئینہ لیکے ہاتھ میں گرتے ہیں منہ کے بل　　اس نازنین پنے پہ خود انکی نظر ہے
~ دل نازنین پنے میں جو لوگے تو ہوگا کیا　　کیونکر اُٹھینگے ناز دلِ بیقرار کے

(۹) پہ بجائے پر

پہ بجائے پر کی نسبت راقم کا خیال ہے کہ اسکا ترک جائز ہے لیکن استعمال کو ناجائز نہیں۔ تسلیمؔ و جلیلؔ و نظمؔ تک کے کلام میں اسکی مثالیں ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو

قائمؔ ~ ہر دم شرار برق سے کیا ارض کیا سما　　ہر ایک ترے منہ پہ تبسم فروش ہے
مصحفیؔ ~ شبِ فراق میں دیکھا جو کچھ کہیں دیکھا　　سحر ہوئے پہ کہو دار دیکھئے کیا ہو
جرأتؔ ~ خیال بدگمانی ہمکو لیجاتا ہے کس کس جا　　نظر آتا ہے جب اس در پہ ہنگامہ سوا
غالبؔ ~ میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
اسیرؔ ~ سماعت نہ بصارت نہ طاقت ہے نہ دور　　اس خرابی پہ بھی جینے کی ہوس باقی ہے

سلیم ؎ گر وہ نہ ہوئے فیصلۂ حشر پہ راضی — کیا ہوگا پھر انجام خدایا مرے دل کا
رسا ؎ کس منہ سے کریں شکوۂ رنجش کہ شب وصل — اک بات پہ بگڑے تھے ہمیں یار سے پہلے
طالب طباطبائی ؎ آئی تھی اب مزے پہ کہانی شباب کی :: کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا
جلیل مانکپوری ؎ روئے رنگین پہ پسینے کا عجب عالم تھا :: آب آتش کو بہم دست و گریبان دیکھا

(۱۰) ہائے

اس لفظ کے متعلق بھی راقم حروف کی وہی رائے ہے جو پہ بجائے پر کی نسبت ظاہر کی جا چکی ہے۔ مثلاً

جرأت ؎ دل کے لگا تے ہی جی تن سے ہائے نکلا — دل لگا نیکا تھا ارمان سو ہائے نکلا
رسا ؎ شب وصال میں پیمانہ ساں تمام ہوئے — فراقِ یار کا دیکھا نہ ہمنے ہائے دن
ظفر ؎ ہلکو تھا منظور اپنی خاکساری کا نباہ — ہائے اس نقش قدم کیسا دکھ اچھی نکلی
ناسخ ؎ بام پر وہ ماہ کرتا ہے نظارا صبح کا — آج ہائے خوب چمکا ہے ستارا صبح کا
مہر لکھنوی ؎ بانکپن سیکھا سنبھالے تمنے ہائے ہاتھ پاؤں :: چھوٹ میں کیا خوب چلتے ہیں تمہارے ہاتھ پاؤں
ذکی دہلوی ؎ گرمی سے پھر نظر آنیلگی سبزہ کی نمود — ہائے آباد ہوا کلبۂ ویران اپنا
اسمٰعیل میرٹھی ؎ ابتدا سے حشر کا سنتے چلے آتے تھے نام :: ہوگیا ہائے یقین حاصل تری رفتار سے
حسرت موہانی ؎ کسقدر دشوار تھی ہمپر جدائی آپکی :: ہائے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپکی

(۱۱) بیچ بجائے میں و درمیان

بیچ بھی متروکات جائز میں سے ہے جسکا ترک اولیٰ ہے مگر خواص کے لئے اسکے استعمال میں بھی کچھ مضائقہ نہیں مثلاً

میر ؎ بوئے خون آتی ہے یاں دوستی یار کے بیچ :: جان لی اُن نے ہزاروں کی یونہی پیار کے بیچ
لا علم ؎ یونہی فسانۂ شب غم تھا بہت طویل — پھر اسپہ بیچ بیچ میں کچھ داستان دل
حسرت موہانی ؎ حسن بیتاب ہے محدود انھیں دو چار کے بیچ :: تیری رفتار کے اندر مری گفتار کے بیچ

(۱۲) تھوڑی بجائے تھوڑا ہی

ماہر ؎ گلفشِ شمع تھوڑی ہوں کہ اک شب میں پگھل کر رہ جاؤں :: دشمن جاں مرے سر پہ ہے تو کیا ہوتا ہے

(۱۳۳) جوں بمعنی مانند

شاہ نصیر ۔ عالم میں جوں ہے نو مذکور ہمارا   ہر شہر میں بھی شہرہ مشہور ہے ہمارا

ولہ ۔ لے اڑا باد کے مانند یہ پانی ساقی   کشتی مے ہوئی جوں تخت سلیمان پیالہ

(۱۳۴) جو کہ یا کہ جو بجائے جو

میر ۔ افسوس وے شہید کہ جو قتلگاہ میں   لگتے ہی اسکے ہاتھ کی تلوار مر گئے

جرأت ۔ کیونکر اب اُس سے ملاقات ہو آن کہیں ؛ دل دیا اُسکو کہ آیا تھا جو مہمان کہیں

۔ حیرت ہے کہ کل اُسنے کہی کان میں اپنے ؛ وہ بات کہ مطلق جو نہ تھی درمیان میں

اردو میں جو اُسی مقام پر استعمال کیا جاتا ہے جہان فارسی میں کہ بولتے ہیں مثلاً

آتش ۔ حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی ؛ کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیان تھا

فارسی میں "پردہ کہ درمیان بود" کہتے ہیں۔ اردو میں یا تو بتقلید فارسی "پردہ کہ درمیان" کہینگے یا "پردہ جو درمیان تھا" "پردہ کہ جو درمیان تھا" جیسا کہ آتش کے شعر میں کسیطرح صحیح نہیں ہو سکتا اور یقیناً داخل متروکات جائز ہے۔ اگرچہ متقدمین سے لیکر متاخرین بلکہ مشاہیر شعرائے موجودہ تک کے کلام میں اسکی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

غالب ۔ جو کہ بخشے گا تجھکو فر فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مے گلفام

ذکی مراد آبادی ۔ جو کہ رکھتے تھے فقیرانہ لباسی کا مزہ ؛ اُنکے دلکو ہوس اطلس و کمخواب کہاں

خواجہ وزیر ۔ صد چاک ہو وہ دل کہ جو درد آشنا نہو ؛ پھوٹے وہ آنکھ جس سے کہ آنسو گرا نہو

نادر ۔ غیر کیا کور نمک ہیں کہ جو زخمی ہو کر   ذائقہ بھول گئے ہیں نمک افشانی کا

آباد ۔ آرزوئے قتل ہے خنجر گلے پر پھیر دے   کون وہ رگ ہے کہ جو مشتاق گردن

مجروح ۔ جو کہ غیروں کو آشنا جانے   وہ بھلا قدر میری کیا جانے

رضا علی وحشت ۔ کبھی بھولکر بھی وحشت نہ کیا خیال فردا ؛ میں ہوں اُسی سے غافل کہ جو کام ہے قضا کا

حفیظ جونپوری ۔ جو الگ رہتے ہیں سمجھے وہی اچھے ہیں غریب ؛ شامت انکی ہو کہ جو تیرے قریں ہو

اکبر الہ آبادی ۔ نظر وہ ہے کہ جو دلبر نقش حسن مدعا کھینچے ؛ نفس وہ ہے کہ جو سینے میں آئے دلکشا ہو

شاد عظیم آبادی ۔ جلوہ ترا دیکھا کہ جو خاموش ہوئی دھوپ ؛ موسیٰ کیطرح گرتے ہی خاموش ہوا

بیخود دہلوی ؎ تھا وہ دوست تو دشمن بھی زنہار نہ تھا :: کیا وہ اٹھتے کہ جو دل کو ناگوار نہ تھا

" ؎ ہائے وہ شخص کہ جو محوِ رخ یار رہا :: حیف اس دل پہ کہ جو طالب دیدار رہا

(۱۵) عاقبت بمعنی آخرکار

عاقبت بمعنی آخرکار فارسی میں عموماً مستعمل ہے۔ مثلاً

کس نیاموخت علم تیر از من :: کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

اردو میں اسکی مثال خاصکر اُن شاعروں کے کلام میں ملتی ہے جنکو فارسی ادب میں بھی دستگاہ کامل حاصل تھی مثلاً

شیفتہ ؎ عاقبت چاہ ذقن میں خبر اسکی پائی :: مدتوں سے نہیں لگتا تھا ٹھکانا دل کا

(۱۶) کیونکہ بجائے کیونکر

کیونکہ بجائے کیونکر کا داخل متروکات ہونا مسلم ہے۔ اگرچہ ولی سے لیکر مجروح و عاشق دہلوی شاگردان غالب تک کے کلام میں اسکی مثال ملتی ہے ملاحظہ ہو

ولی ؎ کیونکہ حاصل ہو مجھکو جمعیت :: زلف تیری قرار کھوتی ہے

قائم ؎ راز دل سوختگان کیونکہ چھپائے سے چھپے :: ہوتی ہے پردۂ فانوس میں رسوائی شمع

مصحفی ؎ چین سے کیونکہ میں سوؤں کہ شب ہجر مجھے :: یاد آتا ہے وہ راتوں کا جگانا تیرا

ہوس ؎ لباس خون نہ ہووے کیونکہ تیغ وشتاب کا جوڑا :: کہ بھاسی ہے اس رشک گل مہتاب کا جوڑا

مخمور ؎ کیونکہ لوں مخمور بوسہ شاہد گلرنگ کا :: منہ پہ بیٹھے ہیں بنائے مے احمر کے پاس

جرأت ؎ جیتے پابوس بھی ہونے نہ دیا وصل کی رات :: اور کچھ اسکو بھلا کیونکہ گوارا ہوگا

میر ممنون ؎ گمان نہ کیونکہ کروں تجھپہ دل چرانیکا :: جھکا کے آنکھ سبب کیا ہے مسکرانے کا

تنہا ؎ دوشالا وہ نازک بدن کیونکہ اوڑھے :: کرے جسکے سر پہ گرانی دوپٹا

مومن ؎ کیونکہ نہ آدھی رات تک جاگ وہ جسکا دھیان ہو :: آہ بیخواب میں نرگس نیم باز بیں

غالب ؎ جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی :: گفتۂ غالب ایکبار پڑھکے اسے سنا کہ یوں

" ؎ نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بدعہدی :: تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

شاہ ظفر ؎ دوستو جی کیونکہ اپنا اسکے جی میں ڈالدوں :: جو عدو دشمنوں کی دشمنی میں الدوں

مجروح ـ وہ گمراہ غیروں کے ہمراہ ہے   آسے راہ پر کیونکر لائینگے ہم

عاشق دہلوی ـ یقین ہوں کیونکر انکھوں بیقراریاں دل کی :: کہ پاس آکے جو بیٹھے تو اضطراب نہ تھا

حسرت موہانی ـ کیونکر چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں :: دل کی تپش کو کیا کہوں سوزِ جگر کو کیا کروں

آجکل کیونکہ کی جگہ کیسے بولتے ہیں ـ :: ہم ان دونوں کے مفہوم میں جو خفیف فرق ہے وہ اہل نظر پر روشن ہے اگرچہ بذریعہ الفاظ اسکا اظہار دشوار معلوم ہوتا ہے ـ

(۱۶) کیجے دیجے بجائے کیجئے دیجئے وغیرہ

میر ـ عزم ہے جزم کہ اب کی حرکت شہر سے کر   ہو جے دل کھول کے ساکن کسو ویرانے کے

تنہا ـ اس وقت ترے روبرو کہتے آئینہ   سو نے سے تو اٹھا ہے کچھ اے نازنین خفا

شہیدی ـ وہ دیدہ ستم ہمیشہ کر جاتے ہیں کیسے   گر کیجے گلا صاف مکر جاتے ہیں کیسے

غالب ـ جور یا نہ ہائے دشمن کی شکایت کیجے   یا بیان کیجے سپاس لذت آزار دوست

وہ ـ جا کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو   یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہمکو

آتش ـ لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب :: زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ظفر ـ جی میں ہے ظفر کیجے خالی دم بیہوشی   شیشے کو لبِ ساغر اور خم کو لبِ شیشہ

شیفتہ ـ میں نے جو کہا ہمدم اتنا تو سمجھ   تو چین بجبین ہو کے کہا ہو نہیں سکتا

ناظم ـ اور کیا نالہ و فریاد سے حاصل مجھکو   پھیر دیجے کہیں گھبرا کے مرا دل مجھکو

داغ ـ غضب میں جان ہے کیا کیجے بدلا رنج فرقت کا :: بدی سے کر نہیں سکتے خوشی سے ہو نہیں سکتا

دلیر مارہروی ـ بخشئے اپنے عاشق کا قصور :: بندہ پرور کیا کرے انسان ہے

حسرت موہانی ـ کیا کیجے بیان اس تن نازک کی حقیقت :: خوشبو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہے رنگ

(۱۸) لیجو دیجو بجائے لینا دینا وغیرہ

میر سوز ـ جاتا ہے دل تو جائیو ہشیار آجکل   چلتی ہے اسکے کوچے میں تلوار آجکل

میر درد ـ ہر چند تجھے صبر نہیں درد و لیکن   اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

ضیا استاد جرأت ـ یارب تو خبر کیجو قاصد کی مری کہ :: گھر کو ہی اسکے بھولا یا راہ پھری ہے

میر حسن ـ شب وصل اس صنم ہو آج لیجو ہم کو ڈھب سے :: گریبان سحر کو تا نک دیکھو دامن شب سے

"ٹانک دینا" کی جگہ "ٹانک دیجیو" تھا جو مخفف ہوکر "ٹانک دیجو" ہوگیا۔

قائم ۔ عزم کعبے کا تو قائم تو کیا ہے لیکن   رہن مے کیجو نہ واں جامۂ احرام کہیں

مصحفی ۔ راہ میں کشتہ پڑے ہیں کئی ارمان بھرے :: کیجیے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے

تو کیا ہے یعنی تو نے کیا ہے ۔ کیجو بجائے کیجیو۔

قدرت ۔ آگ اس داغ کو لگیو جو نمک سود نہیں :: پھوٹے وہ آنکھ جو لخت جگر آلود نہیں

اس شعر میں آگ لگے کی جگہ آگ لگیو لکھا ہے اور ایسا ہی غالب و مومن کے اشعار

ذیل میں بھی ہے۔

مومن ۔ ہر مو سے سوز غم نے شعلہ اٹھا کے چھوڑا :: الفت کو آگ لگیو آخر جلا کے چھوڑا

غالب ۔ مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہوجیو :: نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

" ۔ یہ غم ہجر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے   تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بخم آگے

" ۔ بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو   پر ہے سائے کی طرح میرا شبستان مجھ سے

کیجیو دیجیو وغیرہ کی جگہ کیجو اور دیجو کا استعمال متروک ضرور ہے مگر برا نہیں معلوم ہوتا لیکن

برخلاف ہوجیو کے بجائے ہوجو برا بھی معلوم ہوتا ہے۔

نوا بدایونی ۔ کیجو نہ اے رقیب اسکی مصاحبت پہ ناز :: کچھ دنوں بزم یار میں ہمکو بھی اعتبار تھا

تنہا ۔ سب کچھ ہی کہیو اے دل اندوہگیں خفا   پر اتنا پاس رکھ کہ نہ ہو وہ کہیں خفا

"اتنا پاس رکھ" یعنی "اتنا پاس یا اتنا خیال رکھ کے"

اسیر ۔ پہلے زندوں میں ہو شہرہ یک اسیر   بیٹھیو لعبد پارسا ہوکر

نادر ۔ کیا ہے وعدہ تو پھر بزم رقیباں میں آنا   نہ کیجیو مجھے تم شرمسار ہولی میں

اسیر ۔ خط میں لکھا ہے یار نے تجھکو سلام شوق :: قاصد مری طرف سے کہی کہیو پیام شوق

اشرف کمنڈوی ۔ اے انتظار خضر نہ اتنا جگائیو :: آنکھیں کھلینگی دل کا تقاضا تمام شب

حالی ۔ دیکھ لے امید کیجو تجھ سے نہ کنارا   تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

اشرف عظیم آبادی ۔ دونوں جہان کے رنج والم کا ہے نام عشق :: اے دل نہ نام لیجیو زنہار عشق کا

حسرت موہانی ۔ وا مالیا صبر ہاتھ سے حسرت نہ دیجیو :: گر خواہش طرب ہے تجھے ہم بلا کے بعد

(۱۹) گر بجائے اگر

نسیم دہلوی ۔ ہمنے کاٹی ہے شبِ غم نالہ و فریاد میں :: واے گر یوں یہ نفس بھی زیست کی تعداد میں
عرش لکھنوی ۔ خاک سے میری گلِ عیش نہو گر پیدا :: نخلِ ماتم تو ہوا ہے چرخِ ستمگر پیدا

(۲۰) ہووے - دیوے - لیوے بجائے ہو - دے - لے وغیرہ

جعفر علی حسرت ۔ نظر آئیگی تری عشوہ نمائی ہمکو :: جینے دیویگا اگر درد جدائی ہمکو
جرات ۔ اسکی ٹک آواز سن لیویں ہم اُٹھتے بیٹھتے :: گر میسر ہووے دیوار اُٹھنا بیٹھنا
عیشی ۔ ناز و انداز میں وہ شوخ لگا کرنے تمیز :: عیشی اب دیکھئے احوال مرا کیا ہووے
ظفر ۔ خبر بھی کسکو سینے میں کرینگے یہ ہجوم اتنا :: کہ مجھکو سانس بھی یہ درد و غم لینے نہ دیوینگے
غالب ۔ کام اُس سے آپڑا ہے کہ جسکا جہان میں :: لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

(۲۱) مارے بمعنی بسبب

مصحفی ۔ بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر :: تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے
" ۔ چاند ابر میں جاتا ہے چھپا شرم کے مارے :: شاید کہ ترا پردۂ رخسار اُٹھا ہے
مجنوں ۔ کہیں مجنوں نہ پیچھے رہ گیا ہو ضعف کے مارے :: جو لیلیٰ دیکھتی جاتی ہے پھر پھر کر عماری سے
غافل ۔ خاک پر مارے ادب کے نہ گرائے آنسو :: ہمنے چہرے ہی پہ مل مل کے مٹائے آنسو
آتش ۔ مرتے ہیں رشک کے مارے پسِ دیوار رقیب :: شور کرتا ہے جو پازیب کا دانہ شبِ وصل
ناسخ ۔ بیٹھنے کا قصد کرتا ہوں جو کوچۂ یار میں :: سایہ چڑھ جاتا ہے مارے بخل کے دیوار پر
رشک ۔ منھ سے نقاب اُٹھاتے نہیں فرطِ شرم سے :: زلفیں نہیں دکھاتے وہ مارے حجاب کے
خواجہ وزیر ۔ کیا قتل اُسنے بُزدل کو مرے ہم رشک کے مارے :: اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہوکر
مہر لکھنوی ۔ لپٹ کر اُس پری کیساتھ سونا یاد آتا ہے :: مرا دم کیوں نہ مارے رنج کے ہنگامِ خواب اُلجھے
بحر لکھنوی ۔ مسافرانِ عدم کو وہ راہ ہے درپیش :: کہ مارے خوف کے جاتا ہے کارواں خاموش
" ۔ عاشق سے جھپکتی ہیں لجائی ہوئی آنکھیں :: ہر دم کبھی شرم کے مارے نہیں آتے
منشی منیر ۔ کیا کثرتِ غم ہے کہ ہوا بھی نہیں آتی :: گرمی ہے سوا بھیڑ کے مارے کئی دن سے
" ۔ سینے میں سماتا نہیں اب مارے خوشی کے :: ناحق کو مزاج آپنے پوچھا مرے دل کا

حسرت موہانی ۔ اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو ؛ بکھرے جاتے ہیں رخ یار پہ سارے گیسو

(۲۲) مگر بمعنی شاید

نوا بدایونی ۔ اے شک تو کہاں ہے جو جا ہوں ٹپک پڑے ؛ آنکھوں سے وقت گریہ مگر خون ٹپک پڑے

زکی مرادآبادی ۔ زندگی جوں شمع اپنی زندگی جلتے ہی کٹتی ہے ؛ کیا ہے سوز دل کیواسطے ہمکو مگر پیدا

آتش ۔ مگر چاہا نہیں شاید کہ یاں سے اہل عالم کو ؛ یہ دو دن کیلئے کیا قصر و ایوان مول لیتے ہیں

اسیر ۔ گل تازہ ہے جو تن پر ہمارے زخم کاری ہے ؛ مگر شمشیر قاتل موجۂ باد بہاری ہے

آتش کے شعر میں مگر اور شاید دونوں ہیں اسکو از قبیل شاذ سمجھنا چاہیے

آتش ۔ مگر آنکو فریب نرگس مستانہ آتا ہے ۔ الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

شیفتہ ۔ مشاطہ نے مگر رخ گل سیمیا کیا ۔ گلبرگ کو جو غنچۂ سوسن بنا دیا

غالب ۔ دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا، مگر ۔ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ناسخ ۔ روز یاں سیکڑوں بیہوش پڑے رہتے ہیں ؛ ہے مگر جا نہ خمار ترے کوچے میں

مجروح دہلوی ۔ مگر طعنہ دینگے کہ ہجر اور نیند ۔ وہ پوچھے آکے نہیں خواب میں

زکی دہلوی ۔ کچھ تو اسرار ہے دیوانگی موج میں بھی ؛ زلف خوباں ہے مگر سایہ فگن پانی میں

بحر لکھنوی ۔ نوعروسان بہاری کے مگر پھول کھلے ؛ شہ نشیں غنچے بچھاتے ہیں چمن زار دلن میں

سالک دہلوی ۔ جھکا ہے سر کبھی انکا قتل کرنیکی ندامت سے ؛ مگر گردن پہ خون عاشق دلگیر رکھتے ہیں

قمر لکھنوی ۔ نہیں قطرے پسینے کے گل رخسار جاناں پر ؛ مگر گلہائے باغ خلد پر بوندیں ہیں شبنم کی

ناصر لکھنوی ۔ دکھائی بادہ خواروں نے ہیں گردش زمانہ کی ؛ مگر جھاڑو پیالے میں بھی دور آسمان پیدا

اشرف کسمنڈوی ۔ پھر نصیب کمر یار نے کی آج سر دہی ؛ اقبال شہیدان کا مگر اوج پر آیا

جلیل مانکپوری ۔ دیکھی نہیں بہار مگر کوئے یار کی ؛ بیجا ہے اے صبا تجھے گلزار پر گھمنڈ

حسرت موہانی ۔ یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم ؛ یا مگر انکی محبت کا نتیجہ ہے یہی

(۲۳) نے بجائے نہ

میر تقی ۔ نے گل کو ہے ثبات نہ ہمکو ہے اعتبار ؛ کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

قائم ۔ میں وہ اسیر قفس ہوں کہ عمر بھر جسنے ۔ نہ سیر باغ کی نے روئے آشیاں دیکھا

مصحفی ۔ نہ غرفے سے جھانکے نہ کبھی بام پر آئے ؛ پنہاں رہے تم حسن دلآرا کے وہ نوں پر
شہیدی ۔ نہ عشق سرو کا تھے منتی شوق غمزہ کا تھے ہنسی کا ؛ گمان ہو گر تمکو آسی کا سو یہ بدگمانی نہیں گا
تنہا ۔ عجیب طرح کی بہار اندرون کسی پر ہے نہ حور پر وہ لطافت ہے نہ پری پر
عیشی ۔ نہ کبھی روئے نہ ٹپکا سر کو گا ہے سنگ پر ؛ مفت اپنا خون ہوا جرم شکست رنگ
غالب ۔ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترک جستجو ؛ ہیں وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم
زکی مرادآبادی ۔ ساقی رہا نہ بزم خرابات نے حریف ؛ افسانہ رہ گیا مرے حال خراب کا
۔ نے وصل میں قرار نہ آرام ہجر میں ہر حال تری بلا ہے قیامت ہے ہم
شیفتہ ۔ نہ طبع پریشان تھی نہ خاطر متفرق وہ دن بھی عجیب تھے کہ ہم اور آپ تھے
ظفر ۔ نہ درویشوں کا خرقہ چاہیئے نے تاج شاہانہ ؛ مجھے تو ہوش دے اتنا رہوں میں تجھ پہ
وحشت ۔ نے چشم التفات ہے نے تیغ عتاب جینا تمہارے عشق میں دشوار ہو گیا
حسرت موہانی ۔ خم لگا دے ہم بلانوشوں کے منہ سے ساقیا ؛ کام آئیگا نہ ساغر آج نے پیمانہ آ

۲۴۴ ۔ وصلت بجائے وصل

اسیر لکھنوی ۔ دل وصلت جانان کا جو مشتاق ہوا ہے ؛ کچھ اور نہیں واہمہ خلاق ہوا
سحر لکھنوی ۔ کیا نہ دیدار کو شب وصلت دکھائیے ؛ ٹکڑے جو دل تو داغ محبت دکھا
رشک لکھنوی ۔ پھر شکل وصلت بت بے پیر ہو گئی ؛ تقدیر پھر موافق تدبیر ہو گئی
سحر لکھنوی ۔ شب وصلت ہے خوشی میں ہو بسر جکی رات ؛ رت جگا کیجیے اے رشک قمر آج کی
خواجہ وزیر ۔ لڑائی بے سبب کرنا بہانا کرکے کچھ ملنا ؛ اٹھاتے ہیں مزا وصلت میں رنجشہائے بیجا
مشتاق لکھنوی ۔ نگہ سرکی نہ اک پل انتظار روز وصلت میں ؛ بنا تار گریبان سحر تار نظر
نظم لکھنوی طباطبائی ۔ بگڑے کبھی چپکے ہی سے گیسو شب وصلت ؛ نالہ کبھی پازیب کی جھنکار نے کھینچا

۲۴۵ ۔ لیک ۔ وَلے ۔ ولیک ۔ ولیکن بجائے لیکن

میر ۔ میر صاحب بھی اسکے ہاں تھے لیک بندۂ زر خرید کے مانند
تنہا ۔ آئے کو وہ کہتا تو ہے ظاہر میں ولیکن اقرار کے پردے میں ہے انکار ہزار
شہیدی ۔ ہر لحظہ رکھوں ہاتھ میں دل اسکا ولیکن ؛ میں خوف سے شہیدی کے ہوں مجبور

...سخ — گو بیٹھ رہا ہوں ایک جا لیکن ⁂ پامال بسان نقش پا ہوں

... — افتادہ خاک ہوں ولیکن ⁂ میں سایۂ شہپر ہما ہوں

غالب — مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ⁂ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

... — دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا ⁂ نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

عاشق دہلوی — سیر گلشن سے رہے شاد ولیکن افسوس ⁂ لگے معلوم کچھ احوال قفس کا نہ ہوا

اسمٰعیل میرٹھی — نہیں ہے نقص میں خست ولیکن پیدا ہے ⁂ تفاوت آئینہ و سنگ میں صفائی کا

فصل چہارم

متروکات بیجا

متروک بیجا یعنی شعرائے دور آخر و عہد حاضر کے وہ متروکات جنکے ترک کرنے کی راقم حروف کے نزدیک کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ مثلاً

(۱) مت بجائے نہ

میر درد — مت کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جے ⁂ دوستان درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

یہاں پہلے مصرعے میں مت غالباً اسوجہ سے استعمال کیا گیا ہے کہ دوسرے مصرعے میں نہ موجود ہے اور اسکی تکرار شاعر کو منظور نہ تھی ورنہ وہ نہ کہیں عیش تمہارا بھی الخ بھی نظم ہو سکتا تھا۔

قائم — آگے کچھ اسکے ذکر دل زار مت کرو ⁂ سب خیریت ہے اس سے کچھ اظہار مت کرو

حرف نہ میں ہ کی آواز خفیف بلکہ معدوم ہوتی ہے اسکے برخلاف مت کا تلفظ کامل ہوتا ہے اور ضروریات شعر کے لحاظ سے اسکا استعمال حرف نہ کے ناقص تلفظ کے مقابلے میں ناگزیر ہو جایا کرتا ہے چنانچہ اسی بنا پر راقم حروف کے نزدیک مت کو فہرست متروکات میں داخل کرنا کسی طرح سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ملاحظہ ہو۔

تنہا — ہجوم شوق کی مت پوچھ بیکلی ہمدم ⁂ جگہ تھی دل میں بھی کیا کیا خیال خام کو رات

مصحفی — مت دیکھ تو ادھر کیطرف میرے لطف دیکھ ⁂ کافر ہیں تری چشم فسوں ساز کے صدقے

میر حسن — اترائیو مت حسن پہ نادان بہت کچھ ⁂ دیکھا ہے ان آنکھوں نے پریان بہت کچھ

بہوش: مت لے نسیم برگ گل یاسمیں اُلٹ :: سوتے ہیں اُس جبین سے دوپٹا کہیں اُلٹ

اثر عظیم آبادی: نغمہ و مے کا ذکر مت چھیڑو :: جی میں آگوار ہیں دونوں

(۴۲) یاں - واں بجائے یہاں - وہاں

مصحفی: اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے اٹھ آیا :: دیوانے تری خاطر کرتا ہے دلن سارا

جرأت: ضعف ایسا کہ چلیں واں تو چلا جائے کہاں :: اور قلق یہ ہے کہ رہئے تو رہا جائے کہاں

ذوق: ہنسی کیساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا :: کسی نے قہقہہ لے بیخبر مارا تو کیا مارا

ناسخ: تیری محفل میں جو پاس رازپوشی تھا مجھے :: مثل رنگ گل رواں آنکھوں سے یاں خونناب تھا

ظفر: حضرت دل واں کے جانیکی شتابی میں پڑے :: ہائے یہ بیٹھے بٹھائے کس خرابی میں پڑے

شیفتہ: میری خاطر سے چلو شیفتہ واں :: خیر اُن سے تمہیں نفرت ہی سہی

": تمام شورش و سر تا بپا شکایت ہوں :: نعوذ باللہ اگر واں ملے گذار مجھے

ظہیر دہلوی: بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے واں روئے :: کہیں جو ذکر حریفان بادہ خوار آیا

امیر مینائی: ہم چاہیں دل ملیں وہ ملاتے نہیں ہیں آنکھ :: واں جام سے گریز یہاں ہر سبو

(۴۳) تلک بجائے تک

"لفظ تلک کو آجکل کے شعرا نے اتفاق کرکے ترک کر دیا ہے اور اسکو غیر فصیح سمجھتے ہیں۔ تلک کی جگہ تک کہتے ہیں۔ لیکن ہر زبان میں معیار فصاحت محاورہ ہے اور محاورہ میں تلک اور تک دونوں موجود ہیں پھر اسکے ترک کرنیکی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ ایک وجہ سے تلک بہ نسبت تک کے افصح ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن اہل تحقیق نے حروف کے [illegible] و صفات پر نظر کی ہے انھوں نے چھ حرف ایسے پائے ہیں کہ جب کلمے میں انکا کوئی حرف ہو اُس کلمے کو سلیس و فصیح سمجھتے ہیں ان حرفوں کا مجموعہ "مر بنفل" مشہور ہے۔ غرض یہ کہ تلک میں مر بنفل کا لام ہے اور تک میں اسکا کوئی حرف نہیں"[1]

میر درد: ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ :: جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

میر حسن: دل بجھ کر جو چلا اُس بت مغرور تلک :: دیکھنے میں بھی گیا اُسکے تئیں دور تلک

---

[1] سید علی حیدر صاحب طباطبائی شرح دیوان غالب صفحہ [illegible]

میرحسن ۔ جب تلک میں جیا حسن تب تک ۔ غم مرے دل بیچ بے قیاس رہا
قائم ۔ قائم تو اپنی ہستی سمجھا کہاں تلک ۔ اے نا تمام خواب کوئی یہ بھی ہوش تھا
قدرت شاگرد جرأت ۔ گالی کا انتظار تو حد سے گذر چکا ؛ منھ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی
آتش ۔ جانے لگے ہیں اب دم سرد آسمان تلک ؛ ٹھنڈی سڑک بنی ہے یہاں سے وہاں تلک
رسا ۔ کیا ہے قتل مگر مڑکے دیکھتے ہیں مجھے ؛ ابھی تلک نگہ التفات اتنی ہے
ناسخ ۔ موسم گل میں بشر ہے معذور ۔ گل تلک چاک قبا کرتے ہیں
غالب ۔ کیا تعجب کہ اسکو دیکھکر آ جائے رحم ؛ واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
سحر لکھنوی ۔ قصر ایوان تلک ہے مسند زر ؛ قبر تک ساتھ بوریا ہوگا
خواجہ وزیر ۔ یار ہے نازک مزاج اور میں ہوں غمگین کیا کروں ؛ مطلب دل کہتے تلک شور و فغاں ہو جائیگا
لطافت ۔ شمار دیکھے لالے فلک خاکمیں تو ؛ ابھی تلک کوئی دم قیام سے کفن میں نہیں
مذاق بدایونی ۔ وہ آرزو سے طالب کچھ آرزو نہ رہی ؛ جب تلک لگی ملنے کی آرزو نہ ملا
ماہر لکھنوی ۔ ہوا یہ حضرت قارون کے بخل کا انجام ؛ کہ نقد وذات تلک داخل خزانہ ہوا
شاد عظیم آبادی ۔ اے آہ تو نہ کھول سکیگی در قبول ؛ ما ناکہ جا سکے دیر تلک غل مچا ئیگی
میر حسن اور سحر لکھنوی کے اشعار میں تلک اور تک دونوں موجود ہیں پھر جب قدما سے لیکر ناسخ و امیر اور لطافت و ماہر تک نے تلک کے استعمال کو جائز رکھا ہے تو اسکو متروک قرار دینا کسیطرح مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔

(۴۷) اور بروزن فع

شرح دیوان غالب میں مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی لکھتے ہیں کہ حروف جتنے ہیں اُن سب میں اختصار ہی اچھا ہوتا ہے اس سبب سے کہ وہ محض روابط اور صلات ہیں مثلاً جو ۔ تو ۔ شرط و جزا میں اگر اسطرح موزون ہو کہ واؤ تقطیع سے گر جائے تو زیادہ فصیح معلوم ہوتا ہے ۔ برخلاف اسکے کہ دونوں کا وزن میں محسوب ہو اور اشباع تمام ہو کہ وہ بُرا معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن لفظ اور میں فصیح یہی ہے کہ فاع کے وزن پر ہو اختصار اسکا بخلاف اور حروف کے بُرا معلوم ہوتا ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ وسط

او ساقط ہوتا ہے[1]" لیکن جب بول چال میں دونوں طرح بولتے ہیں تو اور پر وزن فع کو غلط لینے یا متروک قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

بیدرد — کبھی خوش بھی کیا ہو دل کسی رند شرابی کا ۔ بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ذاکر — چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں ۔ خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور تم کہیں

جعفر علی حسرت — ہمکو نرگس نے نہ قضا نے کیا ہلاک ۔ اسکے ستم اور اپنی وفا نے کیا ہلاک

مصحفی — پاس میرے وہ ترا نا سے آنا کہاں ۔ وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانہ نہ رہا

غافل — غافل پھر یہاں نہ ہوا وہ شباب میں ۔ کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

ناسخ — رنگ و داغ گل لالہ سے یہ معلوم ہوا ۔ حسن اور عشق ہوئے دونوں برابر پیدا

غالب — ہیں اور آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے ۔ عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

" — تاب لائے ہی بنے گی غالب   واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

" — اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

نوٹ: ایسے مقام پر جیسا کہ غالب کے اس آخری شعر میں ہے جہاں اور بمعنی دوسرا مستعمل ہو ظاہر ہے کہ اور بروزن فع کبھی نظم نہیں کیا جاتا عطف کے معنی میں البتہ جائز ہے۔

مومن — الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ ۔ بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کیساتھ

مجروح — غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھکو برا جانا ۔ سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا

آباد لکھنوی — قتل کر کے جان دینا بات ہے شمشیر کو ۔ دیکھ لے قاتل نہ ہو جو سحر اور اعجاز کا

بیتاب میرٹھی — تڑپنے کو ملا حکم دل آشوب عالم ۔ اور وعدۂ انصاف رہا حشر پہ اپنا

مشتاق — کشتے کئے غیروں کے دل اور ہمکو جلایا ۔ اک تھے تو محبت کے گنہگار ہمیں تھے

نظم طباطبائی — کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا ۔ اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

جلیل — مرنیوالوں سے رکاوٹ نہیں اچھی قاتل ۔ بات رہ جاتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے

رضا علی وحشت — جفائے دشمنان اور بیوفائی ہائے یاران سے ۔ بہت کبیدہ ہو کر وحشت آزردہ جان دنیا

حسرت موہانی — صبر مشکل ہے ضبط ہے دشوار ۔ دل وحشی ہے اور جنون بہار

---

[1] شرح دیوان غالب صفحہ ۵۰

(۵) سو بجائے وہ

ناسخ کے عہد تک عام طور پر "جو" کے جواب میں "سو" کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً

ناسخ ؎ شب کیف پاسے چمن میں کیں پر افشانیاں ؛ جو ترا نقش قدم تھا سو گل مہتاب تھا

آجکل "سو" کے بجائے عموماً "وہ" لکھتے ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ "سو" کا مفہوم پورا پورا "وہ" سے بہت کم ادا ہو سکتا ہے۔ اور اسلئے "سو" کو متروک قرار دینا سراسر ظلم ہے۔ مثلاً

شاہ حاتم ؎ جسکو دیکھا سو یہاں دشمن جان ہے اپنا ؛ دلکو جانا تھا ہم اپنا سو کہاں ہے اپنا

پہلے مصرعے میں "سو" کے بجائے "وہ" لکھ سکتے ہیں لیکن دوسرے مصرعے میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

میر ؎ سینے میں شوق میر کے سب درد ہو گیا ؛ دل پر رکھا تھا ہاتھ سو سر درد ہو گیا

اس شعر میں "سو" کے مفہوم سے پہلو کے توجیہہ بھی نکلتا ہے اور یہ بات "وہ" کے استعمال سے کسطرح حاصل نہیں ہو سکتی۔

میر درد ؎ سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک ؛ اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

" ؎ پیغام یاس بھیج نہ مجھ بیقرار تک ؛ ہوں نیم جان میں سو بھی ترے انتظار تک

" ؎ مژگاں تر ہوں یا رگ تاک بریدہ ہوں ؛ جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

درد کے پہلے اور دوسرے شعر میں "سو" کی جگہ "وہ" لکھ سکتے ہیں۔ مگر تیسرے شعر میں "جو ہوں وہ ہوں" لکھنا آجکل بھی محاورے کے خلاف سمجھا جائیگا۔ جو لوگ "سو" کو متروک قرار دیتے ہیں وہ بھی "جو ہو سو ہو" کی جگہ "جو ہو وہ ہو" نہیں بولتے۔

سودا ؎ آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مل بنا ؛ کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

" ؎ ہر جرم کو ہے عفو ترے عہد میں ظالم ؛ گردن زدنی ہے سو گنہگار محبت

" ؎ جو لگی تو مدتوں سے مساوا ہو گئی ؛ گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی

سودا کے ان تینوں اشعار میں "سو" کا مفہوم "وہ" سے ادا نہیں ہو سکتا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا ایسے موقعوں پر "سو" سے "جو" اور "وہ" دونوں کا مجموعی مفہوم بلکہ کچھ چیز زائد بخوبی ادا ہو جاتا ہے۔

میر حسن ۔ کچھ نہ پوچھو حسن بقول ضیا   اک دم ہیں سو والسپین ہیں ہم

" ۔ یہ سر ہے یہ ہم ہیں یہ ہے تیغ حاضر ؛ جو کچھ جی میں آوے سو فی الفور کیجے

حسن کے دوسرے شعر میں سو کی جگہ شاید لفظ "وہ" کام دیسکتا ہے مگر پہلے شعر میں علاوہ اسکے کہ سو کا مفہوم "وہ" سے پورا پورا ادا نہ ہوگا ایک خرابی یہ بھی واقع ہوگی کہ "وہ والسپین" میں دو واؤ جمع ہو کر ثقل کلام کا موجب ہو جائینگے۔

قائم ۔ جتنے اسباب تھے دنیا کے سو دیکھے قائم ؛ اب وہ ہو فکر کہ ہم ترک سب اسباب کریں

" ۔ اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کی سو چلے ؛ بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کیساتھ

" ۔ گو ذرہ گر کہ خاک پہ ہو میری گرم شور ؛ تھا اک چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا

" ۔ خلش بھی مد نظر ہے ہمیں حرف گیروں کو ؛ سو ہمنے ہاتھ ہی لکھنے سے یک قلم کھینچا

قائم کے پہلے شعر میں سو کے بجائے "وہ" کام دیسکتا ہے۔ مگر دوسرے مصرعے میں بھی "وہ" موجود ہے اسلئے اگر اور کسی سبب سے نہیں تو تکرار الفاظ سے بچنے ہی کے لئے سہی سو کا استعمال بمقابلہ "وہ" بہتر ہے۔

تیسرے شعر میں سو بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے مگر "وہ بھی خموش ہے" کے بجائے "سو وہ بھی خموش" میں زور اور روانی یقیناً زیادہ ہے۔

چوتھے شعر میں سو معنی "پس" مستعمل ہوا ہے جسمیں توجیہہ کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے۔

مصحفی ۔ نالہ سو اپنے اثر سے رہا ہے دعا سو نا قبول ؛ کیا جانے آگیا تھا وہ نامہربان کہاں

مومن ۔ چارۂ دل سوائے صبر نہیں   سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

یہاں پر سو کے معنی "افسردہ" کے ہیں۔ اردو زبان میں سو کا یہ مفہوم شاید کسی اور دو حرفی لفظ سے ادا نہیں ہوسکتا۔

مومن ۔ شکوہ ہے بخت کی کدورت کا   سو مرے خاک میں ملانے کو

غالب ۔ نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے   جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

"سو وہ یاں" کے بجائے "وہ یہاں" ہو سکتا تھا۔ مگر غالب نے "واں" کے مقابلے میں

یاں اور جو کے جواب میں سو لانیکو ترجیح دی ...

رشک ۔ رشک کو کیا پوچھتے ہو دوستو ؛ نقش فنا تھا سو فنا ہو گیا

نسیم دہلوی ۔ میری ہستی اک صدا ہے جو نہ آئے کان میں ؛ شور پنہاں ہوں سو وہ بھی نا آشنا دورکا

رشکی ۔ پیشتر وقت سے مرنا سو وہ امکان میں نہیں ؛ اور جینا بھی کچھ آسان شب ہجران میں نہیں

امیر ۔ پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ ؛ اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

امیر کے اس شعر میں سو بمعنی جو استعمال کیا گیا ہے ۔ فارسی کے تتبع میں ایسے موقع پر کہ بھی آسکتا ہے مثلاً ع اک رسم تھی قدیم کہ موقوف ہو گئی

جلیل ۔ اور احباب تو کیا ساتھ ہمارا دیتے ؛ ایک سایہ تھا سو وہ بھی شب ہجران میں نہیں

حسرت موہانی ۔ نہ پاسکتے کبھی پابند رہ کر قید ہستی میں ؛ سو ہمنے بے نشان ہو کر تجھے اے بے نشان پایا

ان سب مثالوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ شاہ حاتم سے لیکر امیر و جلیل تک نے سو کے استعمال کو جائز رکھا ہے ۔ ایسی حالت میں اسکو فہرست متروکات میں داخل کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا ۔

فصل پنجم
قابل ترک

یعنی وہ الفاظ جو اسوقت تک عموماً مستعمل ہیں اور جائز سمجھے جاتے ہیں لیکن راقم حروف کے نزدیک جنکا ترک اولی ہے مثلاً

(۱) الفاظ کریہ نیز الفاظ متعلق بہ مرگ لاش وغیرہ

غالب ۔ جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ؛ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

راقم حروف کے نزدیک کریدنے کا لفظ مکروہ ہے جسکے استعمال سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہئے ۔

اختر شاہ اودھ ۔ اختر اغیار سے کرتے ہیں جو وہ بحث غلیظ ؛ ہم چھپائے نگہ پاک کھڑے رہتے ہیں

عشق کو غلیظ لکھنا یقیناً مکروہ ہے۔

لا اعلم۔ جز مسیحا نہ کسی سے مرا مردا اٹھا ۔ اُسینے کاندھا دیا آکر تو جنازہ اُٹھا

شاعر کی زبان سے مرگ و متعلقات مرگ کا استعمال ان الفاظ کے واقعی معنوں میں کراہت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اسلیئے راقم حروف کے نزدیک انکا ترک بہرحال اولیٰ ہے۔

ایسے الفاظ کی کثرت شعرائے لکھنو و متبعین لکھنو کے کلام میں عموماً پائی جاتی ہے مثلاً

ماہر لکھنوی ۔ ماہر پہ کس ادا سے وہ شانہ ہلا گئے :: یوں دل ہلا کہ قبر میں لاشہ ہلا کیا

عزیز لکھنوی ۔ رگیں کھینچنے لگیں اب نزع کا ہنگام آتا ہے :: وہ جائیں دیر اُنکی سر پہ سب الزام آتا ہے

حفیظ جونپوری ۔ گرتے تکیے میں کیوں حفیظ کی لاش :: وہ گدا تھا خرابات خانے کا

آتش ۔ فصل گل میں خون حیض دختر رز کا جوش ہے :: گردن قاضی میں دستِ رندِ ساغر نوش ہے

حفیظ ۔ جو دیکھا مرا دم نکلتے ہوئے ۔ وہ اُٹھکر دبے پاؤں چلتے ہوئے

رشک لکھنوی ۔ پڑ گئی ہے پیپ قاتل کے تغافل سے یہاں :: اور زخم دلمیں اے جراح آلائش نہیں

ان اشعار میں آلائش۔ پیپ اور خون حیض کی کراہت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اس قسم کے کل الفاظ یقیناً قابل ترک ہیں۔

(۲) الفاظ رکیک و بے پردہ

امیر ۔ جو چلے بوسے ہیں تو روزمیں اُنھیں نہ گنو :: شروع سال ہوا پھر نیا حساب چلے

بہار ۔ ذرا سر تو ڈھانپو نہیں اوڑھتا ہے :: تمہاری طرح کوئی جاتی دوپٹا

بحر ۔ محرم کے ستارے ٹوٹتے ہیں :: پستان کے انار چھوٹتے ہیں

خواجہ وزیر ۔ سما گئے مرے سینے میں مثل دل شیشے :: تمہارے محتسبو ہاتھ کیا کدو آیا

ان اشعار میں بوسہ۔ جاتی۔ پستان اور کدو ایسے بے پردہ الفاظ ہیں کہ راقم حروف کے نزدیک انکا ترک بہرحال اولیٰ ہے۔ البتہ اگر لفظ بوسہ کسی دوسرے لفظ کیساتھ شامل ہوکر استعمال کیا جائے تو مضائقہ نہیں مثلاً پابوس۔

(۳) بعض الفاظ فارسی کا استعمال بلا اضافت مثل پا۔ کوہ۔ رہ وغیرہ

مومن ۔ یاد ان رفتہ بھول گئے ہم کو اے ہوش :: رہ میں کسی نے لوٹ لیا کاروان دل

مخمورؔ — جب دست غیر سے ترے پا میں حنا لگی :: اک آگ تھی کہ بس مرے سینے میں آ لگی
مومنؔ — کر دئیے اپنے آنے جانے کے :: تذکرے جائے جائے لوگوں نے
جائے جائے یعنی جگہ جگہ -

غالبؔ — فروغِ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق :: نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے نہ گر خار آتش
" — آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد :: مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
" — ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال :: آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
بلا اضافت رہ گنہ اور مہ کے بجائے اردو میں راہ. گناہ - اور ماہ استعمال کرنا چاہیئے
البتہ اضافت کیساتھ دوری رہ - ذوقِ گنہ - اور حسنِ مہ کہنے میں کوئی ہرج نہیں -
عرشؔ لکھنوی — پھیل کر سوسے بحر میں جبین سے بعد فنا :: ہاتھ دنیا سے جو کھینچا خود بخود پا بڑھ گیا
شیفتہؔ — یاد آئیگی جو عطر فشانی اسکی کو مجھے :: لیجائیگی بہشت میں گلشن کی بو مجھے
" — ہے کفِ پائے عدو پا سے ترے رنگین تر :: بسکہ ہم روتے ہیں خوناب ترے کوچے میں
دیکھ لیجئے کہ اس شعر میں اضافت کے ساتھ کفِ پا میں پا کا استعمال بالکل مناسب ہے
لیکن اسی کے متصل "ترے پا سے" میں خالی لفظ پا کا استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا -
شگفتہؔ دہلوی — کر سکے دفن جو اس کو میں احباب مجھے :: خاک میں ملکی کدورت نہ دیا دات مجھے
عاشقؔ دہلوی — ہاتھ کو مشغلہ ہے چاک گریبان کیطرف :: خود بخود اٹھتے ہیں پا کوچہ جاناں کیطرف
مجروحؔ دہلوی — پا نہ سر کا دُسنگ در ہے یہ :: تم سمجھنا مری جبین نہ کہیں

(۴) استخفاف انبیا و اولیا و ملائکہ

اکثر شعرا استخفاف انبیا اولیاو ملائکہ کو استخفاف واعظ و زاہد کے مانند شاعرانہ شوخی قرار دیکر جائز سمجھتے ہیں مگر راقم حروف کے نزدیک اس سے بہر صورت اجتناب لازم ہے مثلاً
غالبؔ — لو ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں :: اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج
" — پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی :: روح القدس اگرچہ مرا ہمزبان نہیں
داغؔ — پند واعظ سنتے سنتے کان اپنے بھر گئے :: کیا عبادت کو سمجھے ہیں سب فرشتے مر گئے
لاعلم — ع — میں موسیٰ نہیں ہوں جو ڈر جاؤں گا

(۵) آپ جیسا بجائے آپ سا

سا کی جگہ تم جیسا اور تمہاری سی کے بجائے تمہاری جیسی اسوقت تک دہلی اور نواح دہلی کی زبان میں کبھی کبھی سننے میں آتا ہے۔ تحریر یا نظم میں البتہ اسکا استعمال متروک سمجھا جاتا تھا لیکن شاہ نصیر کے وقت سے یہ بدعت شعرائے دہلی میں جاری ہوئی۔ اور اب جدید شعرائے پنجاب میں بھی رائج ہو چلی ہے۔ مثلاً

شاہ نصیر ؎ کہا میں نے کہ مر جاؤں تو بولے ۔۔ کہ تم جیسوں کے مر جانے کا غم کیا

؎ ہمارے اسکے باہم ربط برق و ابر جیسا ہے ۔۔ ہنسے ہے جب وہ اپنے اُسکو ہی آنسو نکلتے ہیں

شادان دکنی ؎ غزال دشت میں کیا ہیں فقط آنکھیں ہی آنکھیں ہیں ۔۔ میاں تیری کمر جیسی کمر ہو تو میں جانوں

سالک دہلوی ؎ مجھ جیسے سخت جان سے کیا بس چلے قضا کا ۔۔ یاں ٹوٹتا رہا ہے اکثر غضب خدا کا

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں حرف سے کی تکرار لازم آتی ہو جیسا کہ سالک کے اس شعر میں "مجھ سے سخت جان سے" لکھنے سے واقع ہوتا یا جہاں عبارت کے مفہوم میں ابہام پیدا ہونیکا اندیشہ ہو سکتا ہو۔ مثلاً رشک لکھنوی کے اس شعر میں

؎ آگ باغوں میں لگا دے ہر صدائے عندلیب ۔۔ میرے نالوں سے اگر ہوں نالہ ہا عندلیب

ایسے کل موقعوں پر اکثر دہلی والے سا کے بجائے جیسا اور اہل لکھنؤ سے کی جگہ کے سے یا کے ایسے استعمال کرتے ہیں۔ مگر راقم حروف کے نزدیک جیسا اور جیسے کا استعمال قابل ترک ہے۔

بعض موجودہ شعرائے دہلی سا اور جیسا دونوں لکھتے ہیں مثلاً

بیخود دہلوی ؎ غیر سا یا ثانی جسکا دنیا میں نہیں ۔۔ آپ جیسا سادہ دل جسکو خبر کچھ بھی نہیں

" ؎ ادا میں دیکھنے بیٹھے ہو کیا آئینے میں اپنی ۔۔ دیا ہے جسنے تم جیسے کو دل اسکا جگر دیکھو

انصاف کی بات یہ ہے کہ بیخود کے اس آخری شعر میں "تم جیسے" کا مفہوم صرف تمسے سے ادا نہیں ہو سکتا ایسے موقعوں پر تم جیسے کی جگہ "تمسے کافر" یا "تمسے ستمگر" یا "تمسے پریرو" لکھنا پڑیگا۔ بیشک "تم جیسے" کی جگہ تم ایسے بھی لکھ سکتے ہیں مگر اس مفہوم میں محاورہ اردو کے اعتبار سے ایسے کا استعمال بہ نسبت جیسے زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے مثلاً "تم ایسوں کو پوچھتا کون ہے"

(۶) الف ندائیہ مثلاً دلا

راقم حروف کے نزدیک اردو زبان میں الف ندائیہ کا استعمال قابل ترک ہے اگرچہ سودا سے لیکر ناسخ لکھنوی اور متاخرین شعرائے لکھنو مثلاً لطافت و مشتاق تک نے اسکو جائز رکھا ہے مثلاً

سودا — خاری کا نہ کر اپنی دلا یار سے شکوا ∴ رسوا جو ہوا عشق میں کامل تو وہی ہے
عیشی — آمد عشق ہے کر جمع دلا ہوش و حواس ∴ نذر سلطان کو بھلا کچھ تو مہیا ہووے
تنہا — مصروف ہے تو اسکی رضا کا بتا دلا ∴ دن رات دیکھتا ہوں تجھے کار و بار میں
امیر — دلا کیا کبھی گیا کچھ نہ تیغ کے نیچے ∴ زبان بول گئی وقت امتحان دیکھا
پے — ہوس مرگ، دلا ہجر میں بیجا تو نہ تھی ∴ غم مٹا یا نہ گیا رنج اٹھایا نہ گیا
ناسخ — پیری میں ہوئے نالۂ گرم اپنے دلا سرد ∴ معمول ہے چلتی ہے دم صبح ہوا سرد
وزیر — بس دلا پہلے ہی سے ترک سخن کر دیجئے ∴ کوچ آخر تو سوئے ملک خموشاں ہوگا
آباد — پرسش ہر ایک عضو سے ہوگی جدا جدا ∴ آسان دلا سمجھیو نہ دینا حساب کا
اختر شاہ اودھ — دلا شراب کے دو نشے سے ہے مست بہت ∴ کھلی ہیں نرگسی آنکھیں خمار لیتا جا
لطافت — دلا محبت گیسوئے مشکبو تو نہیں ∴ ہزار شکر پریشان گفتگو تو نہیں
مشتاق لکھنوی — آخر شب وصال ہے گستاخ ہو دلا ∴ اب شرم انکی چشم فسوں خواب میں نہیں
شاد عظیم آبادی — تجھ سے پوشیدہ دلا نالۂ غماز بھی تھا ∴ کیا سمجھتے تھے کہ اک خانہ برانداز بھی تھا

(۷) ترکیب فارسی کیساتھ واحد کا استعمال بجائے جمع

ترکیب فارسی کیساتھ واحد کو جمع کے موقع پر استعمال کرنے کی مثالیں اگرچہ دہلی اور لکھنو کے قریب قریب کل شعرائے متاخرین کے کلام میں ملتی ہیں مگر راقم کے نزدیک بہرحال اُسکا ترک اولی ہے مثلاً

امیر — مجمع یاران نہیں ہے جلد شراب اے ساقی ∴ لکۂ ابر دھوان دھار چلے آتے ہیں

یہاں "لکہائے ابر" کے بجائے صرف "لکۂ ابر" لکھنا بیشک قابل ترک ہے

اردو زبان میں فعل جمع کیساتھ مذکر الفاظ میں بشرطیکہ اُنکے آخر میں الف یا ہ نہو کوئی

تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثلاً قالین خریدا۔ قالین خریدے۔ چاقو خریدا۔ چاقو خریدے ہاتھی آیا۔ ہاتھی آئے۔ البتہ مؤنث الفاظ نیز ان مذکر الفاظ میں جنکے آخر میں الف یا ہ ہو تبدیلی لازم ہو جاتی ہے مثلاً شکرا پالا۔ شکرے پالے۔ وعدہ کیا۔ وعدے کئے۔ پردہ اٹھا پردے اٹھے۔ مصیبت آئی۔ مصیبتیں آئیں۔ پیالی ٹوٹی۔ پیالیاں ٹوٹیں، وغیرہ غالباً اسی قاعدۂ کلیہ کے قیاس پر اکثر شعرا ترکیب فارسی کیساتھ بھی واحد کو جمع کے موقع پر لکھنا جائز سمجھتے ہیں مثلاً

ناسخ ۔ یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ ؛ ہے تصور میں بہار لکھنؤ

مہر لکھنوی ۔ کاتبوں کے ہاتھ لکھتے لکھتے شل ہو ہو گئے ؛ ہمنے لکھوائے جواب خط جانان اسقدر

میر اصابہ چرخ نے ظلم سے توڑے ہیں مکان دہلی ؛ ہو رقم خط شکستہ سے بیان دہلی

اختر شاہ آبادی ۔ بیقراری کو مری دیکھ کے اے شاہسوار ؛ با ادب توسن چالاک کھڑے رہتے ہیں

ذکی مرادآبادی ۔ لخت دل آنکھوں سے ٹپکتے تو ہیں لیکن ؛ ڈر ہے کہ نہ ہوں دل احباب کے ٹکڑے

لاعلم ۔ پوشیدہ خدا سے جوہر حسن بتان رہے ؛ اپنے دھوئیں میں آپ یہ شعلے نہان رہے

طاہر فرخ آبادی ۔ دنیا میں سلامت رہیں داغ غم الفت ؛ ہے دل کے لئے گرمی بازار بغل میں

شیدائی میرٹھی ۔ اٹھے فضا لے جب ورق دفتر وجود ؛ سو بار لاکھ بار وہی منتخب ہوا

نظم طباطبائی ۔ دل لئے آرزو جسے لائے نظم حیران ہوں ؛ کسی کے منہ سے حرف آرزو دیکھ کر نکلتے ہیں

تسلیم لکھنوی ۔ اوج پر ہے بے نشان ہو کر بھی شان لکھنؤ ؛ لامکان کو داغ دیتے ہیں مکان لکھنؤ

شہیدی ۔ خم میں اکسیر بھری پیر مغان رکھتے ہیں ؛ چاہتے ہیں جسے تا زیست جوان رکھتے ہیں

یہاں گلعذاران لکھنؤ کے بجائے صرف "گلعذار لکھنؤ"، مکانات دہلی کی جگہ "مکان دہلی" "اوراق دفتر وجود" کے بجائے "ورق دفتر وجود" کا استعمال یقیناً قابل ترک ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں تو گلعذار، جواب، مکان، توسن، لخت، جوہر، داغ، ورق، حرف اور پیر سب ایسے مذکر الفاظ ہیں جنکے آخر میں الف یا ہ نہیں ہے۔

ذیل میں ایسے بھی چند الفاظ کی مثالیں درج کیجاتی ہیں جن کے آخر میں ہ موجود ہے اور اس پر بھی شعراء نے ترکیب فارسی کے ساتھ ان کو واحد ہی نظم کیا ہے ملاحظہ ہو۔

سحر لکھنوی ۔ پیہم جو تازیانۂ تار نفس لگے :: کو سون سمند عمر گریزان نکل گیا
" ۔ نشۂ جوش جوانی میں یہ بیہوش رہے :: وعدۂ عالم ارواح فراموش رہے
لطافت ۔ تمہیں بھی دیکھ لیا ہمنے خوب دیدۂ تر :: لکھا نصیب کا رو کر مٹا نہیں سکتے
مجروح دہلوی ۔ وہ ان اٹکھیلیون سے آتے ہیں :: فتنۂ خفتہ جاگ جاتے ہیں
اثر عظیم آبادی ۔ رسوا جہان میں خلق میں بدنام کر چکے :: تم اپنا کام دیدۂ ناکام کر چکے
جلیل مانکپوری ۔ آج پینے کیلئے کون ہے آنیوالا :: لکۂ ابر جھکے پڑتے ہیں میخانون پر
حسرت موہانی ۔ گریۂ شام سے تو کچھ نہوا :: اُن تک اب نالۂ سحر جائین

جس زمانہ میں یہ شعر لکھا گیا تھا اسوقت تک راقم حروف بھی "نالہائے سحر" کے بجائے "نالۂ سحر" کو کافی اور جائز قرار دیتا تھا۔ اب قابل ترک سمجھتا ہے۔

آخر میں دو شعر ایسے بھی لکھے جاتے ہیں جنمیں سامان اور دیدہ دونون کا واحد استعمال باوجود ترکیب فارسی ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور اسکی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی

نسیم دہلوی ۔ سب ستم سارے وہ سامانِ مصیبت یاد ہیں :: ہم ابھی کنج قفس میں مرغ نو آزاد ہیں
غالب دہلوی ۔ ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا :: ہوتے جو کئی دیدۂ خونناب فشان اور

(۸) لون بمعنی نمک

لون بمعنی نمک ناسخ و آتش نے استعمال کیا ہے مگر قابل ترک ہے۔ مثلاً

آتش ۔ رنج خمار اُٹھانے کی طاقت نہیں مجھے :: پیتا ہون میں شراب میں بھی لون ڈال کے
ناسخ ۔ گر سودۂ الماس نہ تھا لون چھڑکتا :: یہ ہر دہنِ زخم کو قاتل سے گلا ہے

(۹) سالہا بجائے سالہا سال

سالہا سال کے بجائے صرف سالہا اگرچہ مصحفی سے لیکر ناسخ و آتش تک نے استعمال کیا ہے مگر قابل ترک ہے مثلاً مخمور ۔ کیونکر کہون باخدا رہا ہون :: میخانے میں سالہا رہا ہون
مصحفی ۔ اسی سبب تو پریشان رہا ہین دنیا میں :: کہ سالہا تری زلفون کی ابتری دیکھی
آتش ۔ جلد نہلا مجھکو میرے خون سے اے شمشیر یار :: دامن دل سالہا آلودۂ عصیان رہا
ناسخ ۔ ہے برنگِ برق ہنسنا آدمیت سے بعید :: سالہا باران غم سے ہر گل آدم ہوا

(۱۰) مغان بطور واحد خوباں بطور جمع بتاں بجائے بتوں

مغان لفظ مغ کی جمع ہے۔ پیر مغان اسی بناپر اضافت کیساتھ مستعمل ہے یعنی مغوں کا پیر لیکن بعض اساتذہ نے پیر مغان کے بجائے صرف لفظ مغان کو بطور واحد استعمال کیا ہے راقم کے نزدیک ایسا لکھنا بلاشبہ قابل ترک ہے۔ مثلاً

رباعی حالی ۔ آتش پہ مغان نے راگ گایا تیرا۔ الخ

بیخود دہلوی ۔ کیا اے مغان تماشے تیری دکان پر ہیں ؛ جو ہے وہ جانتا ہے ہم آسمان پر ہیں

بیخود کے شعر میں تو صاف ظاہر ہے کہ مغان بجائے پیر مغان استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ حالی کے ہاں ممکن ہے کہ "مغوں نے راگ گایا" کی جگہ مغاں نے راگ گایا لکھا گیا ہو ٹھیک اسی طرح جس طرح غالب کے مشہور شعر ۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

میں خوبوں کے بجائے خوباں لکھا گیا ہے اور کثرت استعمال کی بنا پر بظاہر ناگوار بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اردو زبان کا یہ ایک مسلم قاعدہ ہے کہ مذکر الفاظ بشرطیکہ انکے آخر میں الف یا ہ نہ ہو فعل واحد اور فعل جمع دونوں کیساتھ بصورت واحد ہی استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً واعظ آیا۔ واعظ آئے۔ بت دیکھا۔ بت دیکھے۔ دوست ملا۔ دوست ملے۔ حالانکہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا اور واعظ آمد۔ واعظان آمدند۔ لکھا جاتا ہے پس معلوم ایسا ہوتا ہے کہ متقدمین بلکہ بعض متوسطین اور متاخرین شعرائے اردو نے بھی بہ تقلید رواج فارسی کہیں کہیں افعال جمع کیساتھ اسما کو بھی بصورت جمع استعمال کر لیا ہے۔ مثلاً

مومن ۔ آخر کار بلا صاف ہی قاصد کو جواب ؛ طاق پر رکھکے مرے خط کو بتاں بھول گئے
علیشی ۔ حسن کا عیب تھا ناز کا نقصان نہ تھا ؛ یاد بھولے سے کبھی گر ہمیں خوباں کرتے

حق یہ ہے کہ یہاں خوباں یعنی حسینان کو اگر قاعدہ اردو کے مطابق بصورت واحد استعمال کرتے تو اچھا بھی نہ معلوم ہوتا۔ راقم حروف کے نزدیک اس قسم کے فارسی الفاظ کو بلا اضافت استعمال ہی نہ کرنا چاہئے البتہ اضافت کیساتھ ان کا استعمال بصورت جمع ہی مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

بلکہ ایسی حالت میں عموماً واحد کو جمع کے موقع پر لکھنا یقیناً قابل ترک خیال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل تفصیل کیساتھ اس رسالے کے صفحہ ۳۵ و ۴۵ میں لکھ چکے ہیں۔ مثلاً

ناسخ ۔ یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ ٭ ہے تصور میں بہار لکھنؤ

علاوہ بریں بتوں کی جگہ بتان لکھنا بھی اسی قبیل سے قابل ترک ہے۔ مثلاً

میر ضیا ۔ یہ آرزو ضیا کے دل کی بتان خدا ہے ٭ تم اسکو گالیاں دو اور تمکو وہ دعا دے

قائم ۔ شیخ کو دیکھیے پھر دیکھیے بتاں کس طرح تنزیہ ٭ خدا کو ہم نے سنا ہے تمہیں بتان دیکھا

(۱۱) [illegible] استعمال محاورۂ بہار

لفظ میرے کا بجائے تیرا استعمال جو اہل بہار و بنگال کی زبان کیساتھ مخصوص ہے قابل ترک ہے۔ مثلاً

شاد عظیم آبادی ۔ زبان حال سے کہتا ہے تقوی میرے زاہد کا ٭ میں کب بیٹھا مگر خود بخود دنیا ہٹتی جاتی

رضا علی وحشت ۔ لغزش ہو کچھ قدم میں مجھے بتا کچھ بجز سے آپ ٭ ہاتھوں میں میرے ہاتھ مشق کدھر سے آپ

(۱۲) بہ معنی اسقدر

یہ اسقدر کے معنی میں شاگردان مصحفی اور غالب و مومن نیز ناسخ و شاگردان ناسخ اور متوسطین سے گزر کر متاخرین اکثر شعرائے دور حاضر تک کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے لیکن راقم کے نزدیک قابل ترک ہے۔ مثلاً

مجبور ۔ یہ بادہ نغمات سے چھکے تھے وہ یہ خاک ٭ سو بار چھینکا صور پہ کوئی نہ اٹھا مست

غالب ۔ ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی ٭ کہ صبح عید مجکو بدتر از چاک گریبان ہے

مومن ۔ بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ اب اٹھتا ہوں ٭ تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

ذکی مرادآبادی ۔ دل یہ تڑپا کہ میری جان ہوا ہاتوں میں

اسیر ۔ مسجد سے دور ہے یہ دکان میفروش کی ٭ آتی نہیں ہے کان میں بانگ اذان تلک

" ۔ رو پہ یہ دیکھکر اُس چہرۂ پرنور کو ٭ عین دریا میں بہا دیجیے چراغ طور کو

" ۔ دفور بادہ کشی سے یہ بیہوشی میں رہے ٭ ذرا خبر نہ ہوئی کب یہ صیام آیا

رشک ۔ اس شعر و کا رعب یہ چھایا کہ شام سے ٭ خاموش ہے چراغ سخن انجمن میں آج

رسا — آرزو ہے رہیں آپس میں یہ سرگرم وصال :: یار بھی ہم بھی پسینے میں ہوں تر آجکی رات
خواجہ وزیر — یہ مجھکو شیوۂ افتادگی پسند ہوا :: غبار بھی نہ صبا سے مرا بلند ہوا
ناظم رامپوری — بیجود ہے یہ اُس چشم سیہ مست کا مارا :: ہر چند قیامت ہوئی پر یہ نہیں اٹھتا
لطافت — ہجر کی رات ہے ہم یہ سحر کے مشتاق :: شام سے کان تھے آواز سحر کے مشتاق
حسرت موہانی — سر اُٹھائے بزم جاناں میں بھلا کسکی مجال :: رعب غالب ہے یہ اُسکے جلوۂ مغرور کا

(۱۳) نہ بجائے نہیں، نہیں بجائے نہ، اور نا بجائے نہ

نہ کیساتھ فعل منفی میں ہے بولنا خلاف محاورہ ہے اور قدیم اُردو میں بھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا مثلاً "مجھسے مارے ضعف کے نہ بولا جاتا ہے" غلط اور "نہیں بولا جاتا ہے" یا صرف "نہیں بولا جاتا" صحیح ہے۔ ہاں جہاں نہ عطف کے لئے ہو وہاں ہے کیساتھ جمع کرنا درست ہے جیسے "نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے" عطف کے مقام پر نہیں کہنا خلاف محاورہ ہے (شرح دیوان غالب مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی صفحہ ۲۳۲)

غرضکہ ہے کیساتھ نہ کو جمع کرنا صریحاً خلاف محاورہ ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ شعرائے اُردو کے ہر طبقے میں بعض اساتذہ کے کلام میں اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً۔

میر — عشق دریا ہے ایک لنگر دار :: نہ کسو نے تہ اسکی پائی ہے
سودا — طلب میں سلطنت جم کی نہ صبح و شام کرتا ہوں :: در میخانہ پر جاکر سوال جام کرتا ہوں
قائم — جلوہ چاہے ہے اسے اُس بت ہرجائی کا :: نہ پریشان نظری جرم ہے بینائی کا
غالب — قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب :: وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے
بیگ — شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے :: داغِ دلِ بیدرد گزرگاہ حیا ہے
عرش لکھنوی — فقط نہ نام سے چلتا ہے کام دنیا میں :: کہ زیر سایہ کبھی گل کا نہ رہنیں آتا
سحر لکھنوی — موقع یہی ہے سحر لپٹ جاؤ یار سے :: بیجود ہے نشہ ہے نہ کوئی آس پاس ہے
مجروح — مشوش جو نہ فکر جاہ میں ہے :: وہی تو عیش خاطر خواہ میں ہے

عاشق دہلوی ۔ تلخکامی مجھے کیا کیا نہ مزا دیتی ہے :: شب غم زہر کے سے گھونٹ پلادیتی ہے
ان سب اشعار میں نہ کی جگہ نہیں ہونا چاہیئے ۔ نہیں کے ساتھ نہ کو جمع کرنا صریحاً غلط اور قابل ترک ہے ۔

جسطرح نہ کیساتھ نہ کا جمع کرنا درست نہیں اسیطرح بعض مواقع پر خصوصاً ماضی فعل لازم ماضی تمنائی اور نہی کیساتھ نہیں کا جمع کرنا بھی غلط ہے ۔ مگر بعض شعرا نے اس باب میں بھی کمال بے احتیاطی سے کام لیکر بہت بُری مثالیں قائم کردی ہیں مثلاً

شاد عظیم آبادی ۔ کس سے کس سے نہیں شرمندہ ہوئے دیدۂ شوق :: تو جو ہنگامۂ محشر میں مجھے یاد آیا
یہاں نہیں شرمندہ ہونے کے بجائے شرمندہ نہ ہوئے ہونا چاہیئے تھا ۔

سالک دہلوی ۔ شور افغان بنکے لب پر آگیا :: دلمیں جب غم نے جگہ پائی نہیں
"جگہ پائی نہیں" کے بجائے "جگہ نپائی" ہونا چاہیئے ۔

نظم طباطبائی ۔ جو منع ہوتیں سیہ مستیاں بہار میں نظم :: تو جھوم جھوم کے کالی گھٹا نہیں آتی
نہیں آتی کے بجائے نہ آتی ہونا چاہیئے تھا ۔

بیخود دہلوی ۔ نہ دھوکا دے اگر اے جذب دل تجھ میں اثر ہوتا :: اُسے تو لے نہیں آتا وہ اب تک آ نہیں جاتا
"لے نہیں آتا" کے بجائے "لے نہ آتا" اور "آ نہیں جاتا" کی جگہ "آ نہ جاتا" لکھنا چاہیئے تھا ۔

یاس عظیم آبادی ۔ آخر نگہ شوق اثر کر گئی ظالم :: دل تھا کوئی پتھر نہ تھا کیونکر نہیں ملتا
"کیونکر نہیں ملتا" کی جگہ "کیونکر نہ ملتا" ہونا چاہیئے تھا ۔

عاشق دہلوی ۔ کہاں ہم کہاں غیر سے اختلاط :: اُٹھا ہم پہ بہتان و تہمت نہیں
"بہتان نہیں اُٹھا" کے بجائے "بہتان نہ اُٹھا" لکھنا چاہیئے تھا ۔

بدایون و نواح بدایون میں آج تک کبھی کبھی نہیں کے بجائے لوگ نا بول، جاتے ہیں ۔ مثلاً "مجھسے مارے ضعف کے بولا نا جاتا ہے" یا جب کبھی کسی ضرورت سے حرف نفی کو فعل کے بعد لانا پڑتا ہے تو نہ کی آواز نا کی ہوجاتی ہے ۔ مثلاً

میر تقی میر ۔ وے زلفین عقدہ عقدہ ہیں آفت زمانہ :: عقدہ ہمارے دل کا اُنسے کبھی کچھ کھلا نہ
پر سب صورتیں بھی بلا شبہہ قابل ترک ہیں ۔

(۱۴۹) "کو" کا استعمال فعل مجہول کیساتھ

افسوس ہے کہ فعل مجہول کیساتھ "کو" کا استعمال جو پنجاب میں کثرت کیساتھ رائج ہے اسکی مثالیں بعض شعرائے دہلی کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً

مجروح ۔ واں مرا نامہ نہ کیوں پُرزے اڑایا جاتا ٭ خطِ تقدیر کو کسطرح مٹایا جاتا

حالی ۔ عشق اُسوقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا ٭ گود میں تجھ کو تھا جبکہ کھلایا جاتا

راقم حروف کے نزدیک اس سے حتی الامکان احتراز لازم ہے۔

(۱۵۰) "لگ رہی ہے" بجائے "لگی ہوئی ہے"

افعال لازمی میں "رہا ہے" عموماً فعل کے جاری اور ناتمام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً مکان بن رہا ہے یعنی زیر تعمیر ہے۔ یا حوض بھر رہا ہے یعنی اسمیں پانی آ رہا ہے۔ لیکن بعض اضلاع مغرب مثلاً علیگڑھ، بلند شہر سے لیکر دہلی اور نواح دہلی تک میں "لگ رہا ہے" بجائے "لگا ہوا" عوام کی زبان سے اکثر سننے میں آتا ہے مثلاً مکان میں قفل لگا ہوا ہے کی جگہ یوں بھی بولتے ہیں کہ "قفل لگ رہا ہے" راقم کے نزدیک کم سے کم نظم میں ان معنوں میں "رہا ہے" کا استعمال ضرور قابل ترک ہے۔ اگرچہ شعرا اور خصوصاً شعرائے دہلی کے ہر طبقے میں اسکی مثالیں موجود ہیں ملاحظہ ہو۔

میر ۔ پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے ٭ چہرا اتر رہا ہے کچھ آج اس جوان کا

ء ۔ آنکھیں جو کھل رہی ہیں مرنے کے بعد میری ٭ حسرت یہ تھی کہ اسکو میں اک نگاہ دیکھوں

چہرا اتر رہا ہے یعنی اترا ہوا ہے۔ آنکھیں کھل رہی ہیں یعنی کھلی ہوئی ہیں۔

ضیا استاد میر حسن ۔ ٹک آہ بھی نکل نہ کہیں دل تہلکہ پڑے ٭ یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

جرأت ۔ جب دونوں دونوں طرف سے لگ رہی تھی دل کی لاگ ٭ دیکھ لیتا تھا وہ کیا الفت سے شرمایا ہوا

عیشی ۔ دامن دریا میں ایک آگ سی تھی لگ رہی ٭ رات جو اترا تھا وہ شوخ فرنگ آب میں

شیفتہ ۔ اس لطف سے کہاں ہے نسیم چمن کی بو ٭ جو لطف بھر رہا ہے تمہارے پیام میں

مجروح ۔ خوشی کو کب یہاں آنیکی جا ہے ٭ مرا دل حسرتوں سے بھر رہا ہے

جام بھر رہا ہے یعنی بھرا ہوا ہے۔ آگ لگ رہی تھی یعنی لگی ہوئی تھی۔ لطف بھر رہا ہے یعنی بھرا ہوا ہے۔ یہ سب صورتیں قابل ترک ہیں۔

(١٦) دل جگر بغیر عطف

دل و جگر کے بجائے دل جگر بغیر واؤ عطف متقدمین سے لیکر شعرائے عصر حاضر تک کے کلام میں جا بجا مستعمل نظر آتا ہے مگر راقم کے نزدیک قابل ترک ہے۔ مثلاً

میرؔ ؎ اک رہا مژگاں کی صف میں ایک کے ٹکڑے ہوئے :: دل جگر جو میرؔ دونوں اپنے غمخوار دو نہیں رہے

میر حسنؔ ؎ اٹھتے ہی دل جگر میں اک آگ سی لگا دی :: جانا خراب ہووے اس نالہ و فغاں کا

؎ شب جو تم ہم سے خفا ہو کر سحر کو اٹھ گئے :: شمع ساں رو رو کے ہم بھی دل جگر کو اٹھ گئے

؎ نالہ جب گرم کار ہوتا ہے :: دل کلیجے کے پار ہوتا ہے ـ

دل کلیجے کے پار ہوتا ہے یعنی دل جگر کے پار ہوتا ہے ۔

سحر لکھنوی ؎ نہ سمجھے کیا قتل لاغر سمجھ کر :: بڑے یوں کا بھی دل جگر دیکھ لینا

جلیل ؎ دل جگر دونوں ہیں قاتل کے مقابل دیکھیں :: کون پہلے ہدف تیر قضا ہوتا ہے

(١٧) خوشی بجائے خوش

خوشی بجائے خوش بھی قابل ترک ہے مثلاً

شاہ حاتم ؎ تیرے آنے سے یوں خوشی ہے دل :: جیسے بلبل بہار کی خاطر

آتش ؎ بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد :: خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

(١٨) "لگ گئے" بجائے "لگے"

رونے لگے کی جگہ رونے لگ گئے جو آجکل اکثر پنجاب کے اخباروں اور رسالوں میں دیکھا جاتا ہے یقیناً قابل ترک ہے اگرچہ کہیں کہیں متقدمین کے کلام میں بھی اسکی مثال موجود ہے مثلاً

میرؔ ؎ پھر مرد نے لگ گئے ہم بھی آگے :: تو دیکھو کہ بادیہ سارا رہا بہا پھرا

(١٩) لگے بمعنی معلوم ہو

لگے معلوم ہونے کے معنی میں راقم کے نزدیک قابل ترک ہے مثلاً ـ

سوداؔ ؎ جھکے دل کی تری زلفوں سے میاں آگ لگے :: آنکھ کی نظروں میں جو سی بھی ہو تو آگ لگے

آصف شاگرد سوداؔ ؎ کہا چمن نے کہ رخ کو ترے قمر نہ لگا :: بگڑ کے بولا کہ بل پہ ادھر نظر نہ لگا

رخ کو ترے قمر نہ لگا یعنی قمر تیرے رخ کے برابر نہ معلوم ہوا بلکہ مقابلے میں ہیچ ٹھہرا ۔

مومن ؎ تمہیں اس شوخ کی لگتی ہے یا میری خطا لگتی :: مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

(۲۰) سمیت ساتھ کے معنی میں

سمیت ساتھ کے معنی میں راقم کے نزدیک کم سے کم نظم میں ضرور قابل ترک ہے مثلاً
رشک لکھنوی ؎ آہ سوزاں سے جلا دونگا میں نہار سمیت :: باغ جنت میں جاؤنگا اگر یار سمیت
یار سمیت یعنی مع یار۔ ہمراہ یار۔

(۲۱) تھے بمحاورۂ پنجاب

فعل مجہول کیساتھ تھے کا استعمال خاص اہل پنجاب کا محاورہ، نہایت غیر فصیح اور یقیناً قابل ترک ہے اگرچہ بعض شعرائے دہلی کے کلام میں افسوس ہے کہ اسکی مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً
ظہیر ؎ تھے خوب اسکی طرز ناز پہچانی ہوئی :: چال پہچانی ہوئی آواز پہچانی ہوئی
؎ لیکے دل کو جان تو چھوڑے بھلا امکان کیا :: خوب ہی تھے تجھے ہے دلستاں دیکھا ہوا
تھے اسکی طرز ناز خوب پہچانی ہوئی ہے" کی جگہ "اسکی طرز ناز ہماری خوب پہچانی ہوئی ہے" یا "ہم اسکی طرز ناز کو خوب پہچان چکے ہیں" ہونا چاہیے۔ علی ہذا القیاس "تھے تجھے خوب دیکھا ہوا ہے" کے بجائے "ہم تجھے خوب دیکھ چکے ہیں" یا "تو ہمارا خوب دیکھا بھالا ہوا ہے"۔ ہونا چاہیے تھا

(۲۲) لگتا چلا ہے بجائے لگ چلا ہے

لگ چلا ہے کی جگہ لگتا چلا ہے دہلی کی زبان ہے۔ اگرچہ بطور شاذ بعض متبعین زبان لکھنؤ کے کلام میں بھی اسکی مثال ملتی ہے۔ راقم حروف کے نزدیک اسکا استعمال بہرحال قابل ترک ہے مثلاً
رشک لکھنوی ؎ آمد خط صاف ہے سفاک کے رخسار پر :: مور چا لگتا چلا ہے تیغ حسن یار پر
منیر ؎ برسات جائیگی تو ٹھہر گی وحشت رند :: اڑتی چلے گی لال پری ابر تر کیساتھ
مور چا لگتا چلا ہے، یعنی لگ چلا ہے۔ اڑتی چلیگی یعنی اڑ چلے گی۔

(۲۳) پانوں بجائے پاؤں

پاؤں بروزن گاؤں صحیح ہے۔ اسکے بجائے درازی واؤ کیساتھ پاؤں بروزن بہانوں ۔۔ نوں وغیرہ لکھنا راقم کے نزدیک قابل ترک ہے اگرچہ بعض شعرائے دہلی اسکے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں۔ مثلاً

مجروح دہلوی ؎ اُس گلی میں بجائے نقشِ قدم ؛ ہم بھی پاؤن جمائے بیٹھے ہیں
عاشق دہلوی ؎ مسافر لوٹنے والے اسی منزل میں رہتے ہیں ؛ نہ آؤ تنگی پاؤن خارِ حسرت دلمین سہتے ہیں
مجروح نے تو غضب کیا ہے کہ بعض دیگر الفاظ میں بھی اس قسم کی درازئی واؤ کو جائز رکھا ہے مثلاً
؎ ہوئے فرسودہ اپنے دامنِ شوق ؛ یہ اُلجھاؤ رہے بندِ قبا سے
یا ؎ لگاؤ اگر ہو تو اتنا تو ہو ؛ وہاں بات کی یاں خبر ہو گئی
ایک لکھنوی شاعر کے کلام میں بھی اسکا اشتباہ ہوتا ہے مثلاً
ماہر لکھنوی ؎ تابوت سے تشبیب میں آئے مزار کے ؛ قصّے ہوئے تمام چڑھاؤ اُتار کے
لیکن یہاں زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ ماہر نے درازئی واؤ کو جائز رکھنے کے بجائے ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کیا ہے یعنی دو ہندی الفاظ کے درمیان واو حرفِ عطف کو بتکلف استعمال کیا ہے اور قصّے ہوئے تمام چڑھاؤ اُتار کے لکھا ہے گویا اُردو حرفِ عطف "اور" بروزن فع کی جگہ غلطی سے صرف حرف واؤ لکھدیا ہے۔

(۲۴) کو کا غلط استعمال

اُردو زبان کا ایک مسلّم قاعدہ ہے کہ فعل کی تذکیر و تانیث مفعول کی تذکیر و تانیث کی تابع ہوتی ہے مثلاً کہتے ہیں جلد پڑھا کتاب لکھی قلم بنایا، تلوار چلائی وغیرہ لیکن اگر حرفِ مفعول یعنی کو بھی استعمال کیا گیا ہو تو پھر یہ پابندی باقی نہیں رہتی اور کتاب کو دیکھی نہیں بولتے بلکہ کتاب کو دیکھا بولتے ہیں۔
بعض شعرائے دہلی اس قاعدۂ کلیہ کا لحاظ نہیں کرتے مثلاً
مجروح ؎ جسکو خورشید نے نہ کچھ کم کی ؛ وہ سیاہی ہے اس شبِ غم کی
راقم کے نزدیک اسکو سند سمجھکر اُنکی تقلید کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

(۲۵) آپکو بجائے اپنے کو یا اپنے تئیں

"اپنے کو" یا "اپنے تئیں" یا "اپنے آپ کو" کی جگہ صرف "آپکو" پر اکتفا کرنا بھی راقم کے نزدیک قابلِ ترک ہے مثلاً
مجروح ؎ فلک پر آپ کو کھینچے ہے بجلی ؛ جلا کر میری کنجِ آشیان کو
ناظم رامپوری ؎ میں کیونکہ آپ کو نہ رقیب آفرین کہون ؛ باعث ہوں تیری شہرتِ حسن و جمال کا
"آپکو کھینچے ہے بجلی" کی جگہ "اپنے آپکو" ہونا چاہیے "آپکو رقیب آفرین نہ کہون" کے بجائے اپنے کو، اپنے آپکو۔ یا اپنے تئیں رقیب آفرین نہ کہوں" لکھنا چاہیے۔ اسلئے کہ صرف آپکو لکھنے سے معلوم نہیں ہوتا کہ متکلم اپنی نسبت کچھ کہتا یا کسی دوسرے شخص مخاطب سے آپ کر کے خطاب کرتا ہے۔

فہرست کتب موجودہ دفتر رسالہ اردوئے معلی کانپور

جلد رسالہ اردوئے معلی بابت ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء مکمل و مجلد للعہ

جلد رسالہ اردوئے معلی بابت ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء مکمل و مجلد للعہ

جلد رسالہ اردوئے معلی بابت ۱۹۳۰ء مکمل للعہ جلد رسالہ اردوئے معلی بابت ۱۹۳۱ء مکمل ہجر

دیوان غالب مع شرح از حسرت موہانی مع مقدمہ و مفید حالات غالب تنقید کلام غالب عہ؍

کلیات حسرت موہانی یعنی مجموعہ دواوین حسرت از حصہ اول تا حصہ دہم مع ضمیمہ مکمل ؍

انتخاب کلیات حسرت معہ ترجمہ انگریزی از ہاشمی چھاپہ ٹائپ قابل دید عہ؍

انتخاب سخن از حسرت موہانی گیارہ جلدوں میں

یعنی اردو زبان کے جملہ مستند اور صاحب دیوان شعرا کے نایاب کلام کا انتخاب حسب تفصیل ذیل

انتخاب سخن جلد اول (سلسلہ شاہ حاتم) یعنی انتخاب دواوین بقا۔ رنگین۔ نثار۔ بیدار۔ تاباں۔ ماہر
امیر۔ افسر۔ شباب۔ عشرت۔ طالب۔ معروف۔ شاہ نصیر قیمت ۱۰؍

انتخاب سخن جلد دوم (سلسلہ ذوق) دیوان ذوق چار دواوین داغ۔ رسا۔ جگر قیمت ۱۰؍

انتخاب سخن جلد سوم (سلسلہ مومن) دیوان مومن نسیم۔ تسلیم۔ حسرت موہانی مکمل قیمت ہجر

انتخاب سخن جلد چہارم (سلسلہ مظہر) دیوان حسرت۔ یقین۔ حزین۔ شاکر۔ بیان شاگردان مظہر ۴؍

انتخاب سخن جلد پنجم (سلسلہ جرأت) دیوان حسرت استاد جرأت دیوان جرأت۔ غضنفر۔ رضا۔ رقت
رشوی۔ محنت۔ نصرت۔ معروف۔ محبت۔ جلال۔ شائق۔ نساخ۔ وحشت ۱۰؍

انتخاب سخن جلد ششم (سلسلہ مصحفی) دیوان مصحفی۔ مسرور۔ ہوس۔ منتظر۔ قیمت ۱۲؍

انتخاب سخن جلد ہفتم (سلسلہ آتش) دیوان آتش۔ صبا۔ حنا۔ آہ۔ قمر و فروغ قیمت ۶؍

انتخاب سخن جلد ہشتم (سلسلہ اسیر و امیر) دیوان اسیر۔ امیر و جلیل۔ قیمت ۱۲؍

انتخاب سخن جلد نہم (سلسلہ ناسخ) دیوان ناسخ۔ برق۔ جلال۔ آرزو قیمت ۱۲؍

انتخاب سخن جلد دہم (سلسلہ غالب) دیوان غالب۔ مجروح۔ سالک۔ حالی۔ ذکی۔ شعلہ۔ شبلی عہ؍

انتخاب سخن جلد یازدہم (اساتذہ متفرق) دیوان نعمان۔ راسخ۔ ذوق۔ حکیم۔ ندرت۔ فانی۔ عزیز۔ تحشر ۱۰؍

دیوان شاہ حاتم	۶؍	دیوان نازش بدایونی	۲؍
دیوان میر و راسخ عظیم آبادی	۱۰؍	رسالہ متروکات سخن از حسرت موہانی	۶؍
دیوان سودا و میر درد	۴؍	رسالہ معائب سخن از حسرت موہانی	۶؍
دیوان میر سوز	۳؍	رسالہ محاسن سخن از حسرت موہانی	۶؍
دیوان علی میاں کامل لکھنوی	۸؍	رسالہ ارباب سخن یعنی فہرست و سلاسل شعرائے اردو	۴؍
دیوان نوبت رائے نظر لکھنوی	۲؍		

ملنے کا پتہ:- حسرت موہانی دفتر رسالہ اردوئے معلی کانپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسالہ

معائب سخن

یعنی

باب دوم کتاب نکات سخن

مصنفہ

بد فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے اڈیٹر رسالہ اردوئے معلےٰ کانپور

جسمیں

شاعری کے ۳۵ معائب کی تفصیل اور تحقیق بڑی کاوش اور کوشش کیساتھ

مع متعدد مثالوں کے درج کیگئی ہے

جسکو

حاجی شرف الدین نے اپنے

رئیس المطابع واقع کانپور میں چھاپا

اور حسرت موہانی نے شایع کیا

طبع دوم ۶۲۵ جلد — سنہ ۱۹۳۲ء — قیمت فیجلد ۶/

(غلام حسنین لکھنوی نوشت)

فہرست مضامین رسالہ معائب سخن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب دوم معائب سخن

(۱) عیب تنافر

جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل آجاتے ہیں جنمیں سے پہلے لفظ کا حرف آخر وہی ہوتا ہے جو دوسرے لفظ کا حرف اوّل ہوتا ہے تو ان دونوں حرفوں کے ایکساتھ تلفظ میں ایک قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام عیب تنافر ہے۔ اس سے ہر شاعر کو حتی الامکان احتراز لازم ہے مثلاً۔

میر ۔ آنکھوں میں میری عالم سارا سیاہ ہے اب :: مجھکو بغیر اسکے آتا نہیں نظر کچھ
" ۔ اسکی چشم سیہ ہے وہ جسنے :: کتنے جی مارے اک نگاہ کے بیچ

ان دونوں شعروں میں سیاہ اور سیہ کی "ہ" اور ہے کی "ہ" کے باہم ملنے سے عیب تنافر کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے شعر میں اگر وہ کو ہے سے پہلے کہتے اور پہلا مصرع یوں ہوتا ع اسکی چشم سیہ وہ ہے جسنے ۔ تو یہ خرابی رفع ہو سکتی تھی مگر میر اسکی عموماً پروا نہیں کرتے۔

قائم ۔ نام سنتے ہی اسکا کیوں قائم :: پھر گیا تو نے اضطراب شروع

اس شعر میں اسکا کے آخر میں الف اور کیوں کے شروع میں ک ہے۔ گرچہ کہ الف دبا کر نکلتا ہے اسلئے اسکا کا کاف اور کیوں کا کاف متصل ہو گئے ہیں اور عیب تنافر پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ اسکی صورت خفی ہے جلی نہیں ہے جیسا کہ میر کے شعر میں تھا۔

مصحفی ۔ تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر :: شعلہ سا شب پھرے تھا سرو دمن کے اندر

مصحفی کے دوسرے مصرعے میں شعلہ کا ش سا کا س اور پھر شب کا ش اسطرح ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس مصرعے کو جلد جلد پڑھنا چاہے تو کبھی کبھی "شعلہ تا شب" بھی اسکے منہ سے نکلجائے گا۔

فراسو ۔ دان ہے تمہاری بزم میں مے سرخ جام سرخ :: یاں ہیں سرشک سرخ مری آنکھیں مدام سرخ

اس شعر میں دو کے بجائے تین میم ایک جگہ جمع ہیں اسکو بھی عیب تنافر جلی کی مثال سمجھنا چاہئے۔

مسرور کاکوروی ؎ غیر دن سے ارتباط ہو رکھنا ضرور ہے :: پھر مجھسے اختلاط تمہیں کیا ضرور ہے
اختلاط کے طا اور تمہیں کی ت کا اجتماع بھی ثقل سے خالی نہیں ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ
ہم آواز حروف کی یکجائی سے بھی تنافر کا عیب کم از کم بصورت خفی ضرور پیدا ہو جاتا ہے
بلکہ س دش ، ق دک ، س دص ۔ ک دگ ، اور ز دس کی یکجائی بھی اکثر عیب تنافر کا
موجب ہو جاتی ہے مثلاً

مخمور لکھنوی ؎ مخمور مجھے بادۂ سرخوش سے چھکایا :: ہو نیکی نہیں ساقی کی امداد فراموش
صابر دہلوی ؎ پائیں گر تیرے مرقع کی کچھ ادراق آنکھیں :: سات پردوں میں کہیں اپنی ہیں مشتاق آنکھیں
ناسخ ؎ سو قیس سے افزوں ہے یہ ری رو تری رفتار :: پانوں کی صدا لاکھ ترنم سے زیادہ
جلیل ؎ چشمۂ فیض سے دنیا ہوئی سیراب جلیل :: میرے حصے میں مے عشق کا ساغر آیا
صفدر مرزاپوری ؎ کسقدر لطف مرض میں ہے کہ نام صحت :: بدشگونی ہے ترے عشق کے بیمار دل میں
حسرت موہانی ؎ غرض یہ تھی نہ ہو اہل ہوس کو سیل غم حسرت :: نہاں عشق کو ظاہر میں حق نے بے ثمر کہا
؎ اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت :: کافی نہ ہوئی وسعت میدان تمنا
ثاقب بدایونی ؎ ٹھوکریں خوب کھلائیں مجھے دردسر چرخ :: پانوں سی پانو دیا رزق کے پیمانے کو
غالب ؎ اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعد قتل :: میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
اس شعر میں ق کے ساتھ دو ک جمع ہو گئے ہیں ، یہ عیب تنافر جلی ہے۔
امیر ؎ ہجر میں شام غم آئی ہے ستانے ہمکو :: مدد اے مرگ کہ کیوں آ ہے بلانے ہمکو
صفدر مرزاپوری ؎ کیا تمہیں رنگ لئے بیٹھے ہو رخسار و نمیں :: سیکڑوں پھول ہیں اس رنگ کے گلزار دہن میں
مجروح ؎ اسکی تمکین ناز سے مجروح :: لطف کچھ چھیڑ چھاڑ کا ہوا
شہید کسی ؎ وہ وقت تو آنے دو بتا دینگے شہیدی :: بن آئے کسی شخص پہ مر جاتے ہیں کیسے
ذوق ؎ اے ذوق دیکھہ دختر رز کو نہ منھ لگا :: چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی
آتش ؎ لب جان بخش کے قریب وہ خط :: شرح ہے متن زندگانی کی
ناسخ ؎ کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا :: ماہ ہے ایک خال رخسار شب دیجور کا
؎ ہر سخن کیسا تھا لب پر نالۂ جانکاہ ہے :: تیری فرقت میں سخن تکیہ ہمارا آہ ہے

غالب ؎ قید ہستی سے رہائی معلوم ؛؛ اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں ۔
〃 ؎ ہے دور قدح وجہ پریشانی صہبا ؛؛ یکبار لگا دو خم مے میرے لبوں سے
〃 ؎ جوں نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ؛؛ تو افسردگی نہاں ہے بکمین بے زبانی
〃 ؎ ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا ؛؛ جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
〃 ؎ کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو ؛؛ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
〃 ؎ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے ؛؛ طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر
〃 ؎ ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر ؛؛ ہوں گل فروش شوخی داغ کہن ہنوز
〃 ؎ زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ ؛؛ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں
اسیر ؎ تن سے سر کسکا کریگا وہ ستمگار جدا ؛؛ ایکدم ہاتھ سے ہوتی نہیں تلوار جدا
〃 ؎ مصرع نہ کیوں ہو گرم مری آہ سرد کا ؛؛ مضمون بندھ گیا ہے پہلو سے درد کا
〃 ؎ جو بحر ترنم میں وہ مست ناز ڈوب گیا ؛؛ یہاں سفینۂ عمر دراز ڈوب گیا
〃 ؎ دل جلا کر رخ محبوب کا جلوہ دیکھا ؛؛ ہمنے گھر پھونک کے کیا خوب تماشا دیکھا
مجروح ؎ گو لاکھ بار ریزش ابر بہار ہو ؛؛ ہوں شاخ خشک مجھکو امید ثمر کہاں
وحشت دہلوی ؎ مے بھی داغ جگر مثل لالہ پیتا ہوں ؛؛ ہے ستمگار من گل خوبی کے بانکپن سے مجھے
حالی ؎ روز وداع بھی شب ہجراں سے کم نہیں ؛؛ کچھ صبح ہی سے شام بلا کا ظہور تھا
نادر شاگرد ناسخ ؎ بارش دیدۂ تر ہمنے دکھائی جو اسے ؛؛ غرق ترنم میں کیا کیا نہ نہائی برسات
خواجہ وزیر ؎ چاندنی چھٹکی ہے اے اشک کے سیلاب ہٹے ؛؛ رات کو رہتے جو ہم اک مہ لقا کے واسطے
میر کلو عرش ؎ نزدیک مرگ عشق کے آزار نے کیا ؛؛ پرہیز زیست سے دل بیمار نے کیا
سالک دہلوی ؎ کچھ حال غیر مجھسے قسم سے اگر کہوں ؛؛ ظالم میں وہ نہیں کہ ادھر کی ادھر کہوں
رنگی دہلوی ؎ یوں تو ہے ہر بادہ کو ساقی سے چشم التفات ؛؛ بزم میں ملتا ہے کسکو جام صہبا دیکھئے
بحر لکھنوی ؎ تقریر لگاوٹ کی کسی اور سے رکھئے ؛؛ ہم ایسے فریبوں میں تمہارے نہیں آتے
شاد عظیم آبادی ؎ اپنی ناکامی کا کیا ذکر ہے حشر کے دن ؛؛ کیا قیامت ہے کہ منہ دیکھے گی دنیا اسکا
اشرف کمنڈوی ؎ کھل گیا قلقل مینا سے معما کے سرور ؛؛ فہم میں معنیٔ تحریر خط جام آ گئے

جلیلؔ ؎ حسن کو عشق پہ ترجیح ہے شہرت میں جلیلؔ ٭ بوئے گل میں جو ہے پرواز عنادل میں نہیں
بیخودؔ دہلوی ؎ اکیلا بزمِ دشمن میں اُسے چھوڑا نہیں جاتا ٭ چھپا کر لیچلا ہوں دل میں بھی تنہا نہیں جاتا
" ؎ غیر کی بزم میں میری تو خبر کیا لوگے ٭ ابھی اپنی ہی نہیں تمکو خبر دیکھ لیا
حیات بخش رسا ؎ حباب رف دیکھئے اپنا ہے تمھارا دنکا ٭ نبض میں دم ہے مگر تیرے بیمار دن کا
محویؔ لکھنوی ؎ دل پر محیط رنج و محن کی سیاہ ہے ٭ تم کیا گئے کہ کشورِ راحت تباہ ہے

شہیدؔ ہی سے لیکر تک کے مندرجۂ بالا اشعار میں عیب تنافر کی جو مثالیں دیگئی ہیں وہ خفی قسم کا ہے یعنی ایسا جسکا وجود کچھ زیادہ ناگوار نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اسکا یہ مطلب ہونا چاہئے کہ یہ عیب عیب نہیں ہے۔ ذیل میں ہم چند مثالیں ایسے اشعار کی درج کرتے ہیں جنمیں یہ عیب خفی بظاہر محسوس نہیں ہوتا مگر اُن اشعار کی اصلاح شدہ یا ترمیم شدہ صورت کو دیکھنے کے بعد اس عیب کے واقعی عیب ہونے میں کوئی شک نہیں رہجاتا۔

عبداللہ خان مہرؔ ؎ اسدر ہے ہر مرغ چمن خوف میں صیاد ٭ ہر موج رگ گل پہ ہے زنجیر کا دھوکا

مرزا نسیمؔ مغفور نے دیوان مہرؔ میں جسکا قلمی نسخہ راقم حروف کے پاس موجود ہے اس شعر کے پہلے مصرع کو اپنے قلم سے یوں بدل دیا ہے ع۔ اسدر ہے ہیں سب مرغ چمن خوف میں صیاد سے
اصلاح سے ہر کی تکرار اور ہے ہر کا عیب تنافر دونوں خرابیاں دور ہوگئیں۔

شگفتہؔ ؎ غیر سے کب ہوا ہے ترک کلام ٭ باتیں تم ہم سے بھی بنانے لگے

تیں تم کے تلفظ تت تم میں عیب تنافر بصورت خفی موجود ہے۔ مگر شاید بعض لوگوں کو محسوس نہ ہوتا ہو۔ انکو غور کرنا چاہئے کہ مصرع ثانی یوں بھی ہو سکتا ہے ع باتیں ہمسے بھی تم بنانے لگے۔ اس ترمیم شدہ مصرع کو پیش نظر رکھنے کے بعد غالباً انکو بھی یہ عیب واقعی عیب معلوم ہونے لگے گا۔

مجروحؔ دہلوی ؎ اس نازنین کا خواب آنا محال ہے ٭ اے شوق بے ادب تجھے یہ کیا خیال ہے

دوسرا مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے ع اے شوق بے ادب یہ تجھے کیا خیال ہے
اس ترمیم کو دیکھنے کے بعد تجھے کی تے اور یہ کی ہی کا اجتماع یقیناً معیوب معلوم ہونے لگے گا۔

زکیؔ ؎ خموش بزم میں بیٹھے ہو کوئی بات ہے یہ ٭ زبان تو دی ہے خدا نے تمہیں دہان نہ سہی

یہاں بزم میں کا عیب تنافر قابل التفات نہیں معلوم ہوتا۔ مگر جب یہ بتایا جائے کہ پہلا مصرع

یون بھی ہو سکتا ہے ؎ خموش بیٹھے ہو محفل میں کوئی بات ہے یہ - تو پھر اس عیب کے عیب ہونے میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا -

ماہر لکھنوی ؎ ضعیف و زار ہیں یہ ہم جہان فانی میں ؛؛ بنے ہیں تار نظر چشم ناتوانی میں

پہلا مصرع یون بھی ہو سکتا ہے - ؎ ضعیف و زار ہیں ہم جہان فانی میں

اس حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد غور کیجئے کہ یہ ہم میں عیب تنافر یقیناً موجود ہے یا نہیں -

وحشت ؎ دیکھکر مجکو جو وہ حال مرا جان گئے ؛؛ جی کے ارمان دل بیتاب کے قربان گئے

اگر پہلا مصرع یون ہوتا - ؎ دیکھکر مجکو مرا حال جو وہ جان گئے -

تو وہ حال کا عیب تنافر بلاشبہہ دور ہو جاتا -

(۳) تکرار الفاظ (قبیح)

الفاظ اور حروف کی تکرار عام اس سے کہ وہ شعر کے ایک ہی مصرع میں ہو یا دونوں میں عموماً قبیح سمجھی جاتی ہے اور واقعی ہوتی بھی ہے - اسمیں شبہہ نہیں کہ بعض موقعوں پر تکرار الفاظ حسین بھی ہوتی ہے جسکا بیان اس کتاب کے تیسرے باب میں زیر عنوان محاسن سخن آئیگا انشاء اللہ تعالےٰ یہاں پر صرف معیوب اور مکروہ تکرار کی مثالیں درج کیجاتی ہیں جنسے بچنا ہر شاعر کا فرض ہے

قائم ؎ ناصح وہ فکر کر کہ سلامت رہے قمیص ؛؛ اور پھٹ جیگا تو پھر یہ سلا یا نہ جائے گا

مصحفی ؎ دن میں سو سو بار اب ہم انکے گھر جانے لگے ؛؛ منھ چھپانے وہ لگے ہم انپہ مر جانے لگے

میر حسن ؎ ابتدا حسن کی وہ اسکی نئی چاہ تری ؛؛ ہائے کیا دن تھے حسن اور وہ زمانا کیا تھا

محمور ؎ اس رشک مہ کے آبی ڈوپٹے کے عکس نے ؛؛ اک آسمان تازہ زمین پر بنا دیا

امیر ؎ سامنے یار کے کمرے کے تنایا کمرا ؛؛ در جو توڑا تو اسی در کے مقابل توڑا

واضح رہے کہ یہاں پہلے مصرعے میں کے کی تکرار قبیح اور اسکے برخلاف مصرعہ ثانی میں توڑا کی تکرار حسین واقع ہوئی ہے -

آتش ؎ شراب پینے کی کرتی ہے فصل گل تکلیف ؛؛ دن آتے ہیں بط مے کے شکار کرنے کے

ناسخ ؎ خط کے لانے میں اگر پیک صبا نے دیر کی ؛؛ ہے غضب آنے میں کیون پیک قضا نے دیر کی

غالب ؎ حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب ؛؛ جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا

بعض لوگ غالباً منع عیب کے خیال سے پہلے مصرعے میں قسمت کی جگہ قیمت پڑھتے ہیں حالانکہ غالب نے دونوں مصرعوں میں قسمت ہی لکھا تھا جیسا کہ خود انکے صحیح کئے ہوئے دیوان میں چھپا ہوا موجود ہے۔

غالب ۔ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ۔ یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی ۔ لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
۔ ابھی آتی ہے بو بالش سے اُسکی زلف مشکین کی ۔ ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

اس شعر کا شمار غالب کے اچھے اشعار میں ہوتا ہے۔ اور کثرت استعمال کی بنا پر لوگوں کا خیال اسکے عیب کی جانب نہیں جاتا ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ مصرعۂ اول میں حرف کی کی تکرار بغایت قبیح واقع ہوئی ہے۔ اگر یہ مصرعہ اسطرح لکھا جاتا۔ ع۔ ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس گیسوئے مشکین کی۔ تو یہ خرابی رفع ہو جاتی۔ مگر غالب نے اسطرف توجہ نہیں کی

مجروح ۔ نامہ برنے جواب کے بدلے ۔ خط کے پُرزے دن کو لا دیا ہمکو۔

سحر لکھنوی ۔ کل صبح کو وہ عاشقوں کو قتل کرینگے ۔ کہہ دو کہ سر شام سے حاضر ہے سحر بھی

اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا ع۔ کل صبح سے عشاق کو وہ قتل کرینگے۔ تو عیب تکرار دور ہو جاتا۔

سالک دہلوی ۔ مجھپر ایسی جفا کی کثرت کی ۔ کہ اُسے غیر نے ملامت کی

عاشق دہلوی ۔ انکی چتون کے اشارے کو ہمیں جان گئے ۔ رازداں ایک ہمیں تھے ہمیں پہچان گئے

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ہمیں کی تکرار ناگوار نہیں البتہ پہلے مصرعے میں بھی ہمیں کا استعمال بلاشبہ معیوب ہے۔ اگر مطلع کا خیال نہ ہوتا۔ اور پہلا مصرعہ یوں لکھا جاتا ع۔ انکی چتون کے اشارے نہ کسی نے جانے ۔ تو یہ کمزوری بھی نہ رہتی۔

حفیظ جونپوری ۔ یاد ہے پہلے پہل کی وہ ملاقات کی بات ۔ وہ مرے دن کے نہ بھولینگے نہ وہ راتکی بات

جلیل ۔ ہو گیا سیر منزل یاں اک تڑپ میں جلیل ۔ جو عمر بھر میں نہ ہوتا ہوا وہ دم بھر میں

حسرت موہانی ۔ وہ بھی دل تھام کے رہجائیں جو سن پائیں کبھی ۔ ہو غضب انکی فقیروں کی صدا کی تاثیر

دیوان حسرت کے پہلے ایڈیشن میں یہ شعر اسی طرح چھپا تھا دوسرے ایڈیشن میں ع

ع ۔ ہے غضب اپنی فقیرانہ صدا کی تاثیر۔ کر دیا گیا تا کہ عیب تنافر باقی نہ رہے۔

(۳) ہائے مختفی کے بجائے الف کا استعمال

ترکیب فارسی کے ساتھ ہائے مختفی کی جگہ الف کا استعمال یقیناً ناجائز ہے مگر اردو شاعروں میں کم ایسے ہیں جو اس بات کا لحاظ رکھتے ہوں اور ان سے اس غلطی کا ارتکاب نہ ہوتا ہو مثلاً حسرت استاد جرأت ۔ جلادہ شوخ عینِ شدتِ گریہ میں رخصت ہو: مری آنکھوں نے نہ کا اشکوں کو تھم لینے دیا پہلا مصرعہ پڑھنے میں یوں آتا ہے۔ ع جلادہ شوخ عین شدت گریا میں رخصت ہو۔ گریہ کے بجائے گریا غلط ہے۔

جرأت ۔ جو دل وحشت زدہ پھرتا تھا آوارہ پڑا :: سنتے ہیں جرم محبت پر وہ کل مارا پڑا

تنہا لفظ آوارہ کا قافیہ مارا کیساتھ جیساکہ جرأت کے اس شعر میں ہے جائز سمجھا جاتا ہے لیکن اضافت یا ترکیب فارسی کیساتھ آوارہ کا تلفظ آوارا کے طور پر کرنا کسی طرح صحیح نہیں یہی حال لفظ نظارہ کا ہے کہ تنہا اسکا قافیہ گوارا کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر اضافت فارسی کیساتھ نہیں ہو سکتا۔ جیساکہ مسرور کاکوروی کے اس شعر میں ہے۔

مسرور ۔ رکھنا تو نیچی آنکھ گوارا نہیں سہی :: پر کیا کریں کہ حکم نظارا نہیں نہیں

بلکہ بعض بعض موقعوں پر تو بلا اضافت تنہا لفظ زیادہ کا بھی تلفظ بطور زیادا اچھا نہیں معلوم ہوتا مثلاً

بیخود دہلوی ۔ کھلگئی سب تری باتوں سے شرارت تیری :: شوخ تجھسے بھی زیادہ ہے طبیعت تیری

اس شعر کا دوسرا مصرعہ اگر یوں ہوتا ع شوخ تجھسے بھی ہے کچھ بڑھکے طبیعت تیری ۔ تو بہتر ہوتا ذیل میں متقدمین متوسطین اور متاخرین غرضکہ ہر عہد کے شعرائے اردو کا کلام بطور مثال درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس باب میں احتیاط سے بہت کم لوگوں نے کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حسرت ۔ ہر آن ہے مژگاں پر لختِ جگر تازہ :: یہ نخل محبت میں آیا ثمر تازہ

عیشی ۔ کشت پر اودوں کی کرائے ابرِ تر جلوہ گری :: یاں ہی ہو دانہ دعائے ابرِ رحمت مانگنا

م ۔ مدفنین آبادیاں کیا کیا چمن کی یاد ہیں :: بوئے گل کیطرح ہم گلشن کے غمازادہ ہیں

غافلؔ ـ دیدۂ خونبار گر تعلیم گریہ دے اُسے ۔ شبنمِ گل سے ابھی پیدا ہو طوفانِ بہار
آتشؔ ـ حسنِ بے پردہ کا عالم جلوہ گر پاتا ہوں میں ۔ دم پھڑک جاتا ہے عریاں دیکھکر تلوار کو
اسیرؔ ـ شبنم و گل سے جنوں کے جوش میں ہمنے اسیر ۔ حالِ گریہ کہدیا احوالِ خندہ کہدیا
[illegible] ـ ہمارے در سے درِ میکدہ تلک زاہد ۔ سڑک بنی کہ کوئی جادۂ ثواب بنا
ناسخؔ ـ ایک شب جو تیری محفل میں بنائے بار شمع ۔ صبح ہوتے ہوتے ہو مانندِ رشتہ زار شمع
غالبؔ ـ ہوئی ہے کس قدر ارزانی مے جلوہ ۔ کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
نسیمؔ دہلوی ـ تیغ تو یہ مرگِ عاشق کے تصدق جائے ۔ چشم مصروفِ نظارہ سرِ تہِ زانوے دوست
رشکؔ لکھنوی ـ جبتک رہا میں ہجر زدہ کا بیدر ہیں ۔ آئینۂ بتاں کا علاقہ نگار ہا
بحرؔ لکھنوی ـ جب کبھی تحریر وصفِ حسنِ جانانہ ہوا ۔ شمع خامہ بنگیا مکتوب پروانہ ہوا
سحرؔ لکھنوی ـ بتوں کی ہے خدا خدا شکایت ۔ یہاں ہے شکر در پردہ شکایت
مہرؔ لکھنوی ـ روشنی میرے سیہ خانے میں رہتی ہے مدام ۔ کام آتا ہی شبِ تیرہ میں شعلہ آہ کا
نادرؔ شاگرد ناسخ ـ سب کہتے ہیں کہ اتری ہے شیشے میں یہ پری ۔ ساغر میں جلکہ ہوتی ہے جلوہ نما شراب
نساخؔ ـ جو سنیگا تری غزل نساخ ۔ زمزمہ سنج مرحبا ہوگا
قلقؔ میرٹھی ـ رابطے پردہ نشیں سے رہا تیرے لیے ۔ زندگی اپنی کٹی حرفِ اشارہ ہوکر
مجروحؔ دہلوی ـ ذکرِ تقصیرِ گذشتہ نہیں تعزیر سے کم ۔ یہ ملاقات کی شب ہے کہ مکافات کی رات
[illegible] ـ گلہ کرکے پھر وہی صورت بنا دی جوشِ گریہ نے ۔ پھر اٹھا اک ذرا پانی ترے بیمارِ الفت پر
نظمؔ طباطبائی ـ بادشاہی تھی گدائی درِ میخانہ کی ۔ کہ سلیمان کیطرح لیکے اڑا ہوش مجھے
صفیؔ لکھنوی ـ نہیں ہمدرد اگر پاس تو ہمدم ہی سہی ۔ کوئی اندوہ رُبا ہے دلِ دیوانہ ہو
[illegible] ـ دمِ پروانہ ہو آزاد خیالی پہ نظر ۔ پھنس نہ جائے جو کہیں دامِ تہِ دانہ ہو
حفیظؔ جونپوری ـ کیا غزل کہتے ہو تم اے حفیظ ۔ ختم رنگِ عاشقانہ ہوگیا
ضیغمؔ بلندشہری ـ دعائیں دیں شبِ غم جو تو سنگار کرے ۔ خدا دو چند ترے حسن کی بہار کرے
یاسؔ لکھنوی ـ تصورِ لالہ و گل کا خزاں میں بھی نہیں مٹتا ۔ نگاہِ شوق وابستہ ہے اب تک نقشِ باطل سے
ثاقبؔ بدایونی ـ لے اڑی ہے خانہ بدوشی کی ہوا ۔ جب ٹھکانے کا زمانہ آگیا

جلیل مانکپوری ؎ کیا ستم ہے شب وعدہ وہ خفا ملتے ہیں ٭ رنگ لائے نہ کہیں خون تمنا ہو کر
پہلا مصرع اگر اسطرح ہوتا ؏ کیا ستم ہے وہ شب وعدہ خفا ملتے ہیں ۔ تو بہتر ہوتا ۔
حفیظ جونپوری ؎ حفیظ ان شاہدان نازپیشہ کی محبت میں ٭ ہزاروں مشکلوں کے سامنے ملتے ہیں ضدوں کو
پہلے مصرعے میں نازپیشہ کی جگہ نازپرور ہوتا تو خرابی رفع ہو جاتی ۔
حسرت موہانی ؎ دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر ٭ اے صاحب میخانہ کچھ لطف و عنایت بھی
دیوان حسرت کے جدید اڈیشن میں صاحب میخانہ کے بجائے ساقی جان پرور بنوا دیا گیا ہے ۔

(۴) تعقید لفظی

شوق نیموی اپنے رسالہ ایضاح میں لکھتے ہیں ۔

"اگر لفظ اپنی اصلی جگہ پر نہو تو اسکو تعقید لفظی کہتے ہیں اردو میں فاعل کو فعل و مفعول سے پہلے اور فعل کو سب سے آخر لانا چاہیئے جیسے تم نظر اٹھاؤ اور اگر اسکو یوں کہیں کہ تم اٹھاؤ نظر یا اٹھاؤ نظر تم یا نظر تم اٹھاؤ تعقید ہو جائے گی ۔ اور نون نافیہ فعل سے پہلے ہونا چاہیئے جیسے تم نجاؤ ۔ اگر یوں کہیں کہ تم جاؤ نہ تعقید ٹھہرے گی ۔ اور مضاف الیہ کو مضاف سے مقدم و متصل ہونا چاہیئے جیسے میر کا دیوان ۔ اگر یوں کہیں دیوان میر کا تعقید ہو جائیگی ۔ البتہ بعض مضاف ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیشہ تقدیم ہی چاہتے ہیں ۔ جیسے بے تمہارے اور جب موصوف یا صفت ہندی لفظ ہو تو صفت مقدم لانا چاہیئے ۔ جیسے اچھے قلم خوشنما و حسین ۔ لیکن نظم میں اگر پورے طور پر اسکا برتاؤ کیا جاتا تو شعر کہنا دشوار ہو جاتا ۔ اس سبب سے اکثر جگہ لفظی تعقید معیوب نہیں ٹھہرائی گئی ۔ البتہ جہاں لفظوں کی الٹ پھیر سے ترکیب درست ہو جائے اور نظم میں کچھ خلل نہو تو توبیشک معیوب ہے جیسے ؏ جب نکلتے ہیں سینے سے نالے ؏ جوانی کسی کی کرشمہ کسی کا ؏ ہمارا دل ہے وارفتہ محبت میں حسینوں کی ۔ ؏ بڑے اچھے اچھے اب اس شوخ پر مرنے لگے ہاں اگر انقلاب سے کوئی دوسری خرابی پیدا ہو جیسے ؏ کون آتا ہے سیر گلشن کو ۔ اگر یوں کہیں ؏ سیر گلشن کو کون آتا ہے ۔ تو کو کون کے اجتماع سے مصرع میں ثقل آ جائیگا ۔ یا جیسے دامن کسی کا ۔ مدفن کسی کا ہے ؏ جوانی کسی کی رنگین کسی کا ۔ ایسی صورتوں میں یہ تعقید معیوب نہ ٹھہرے گی "۔

ذیل میں عہدِ میر و سودا سے لیکر شعرائے عہدِ حاضر تک کے کلام سے تعقیدِ لفظی کی مثالیں درج کیجاتی ہیں تاکہ انکو غور سے دیکھکر لوگ اس عیب سے بچنے کی کوشش کریں۔

سودا ۔ رہ گیا ہے مہ نو عید کا کسکے پیاسے ؛؛ کھول کر ہاتھ تمنائے ہم آغوشی میں

متقدمین سودا اور متوسطین میں ذوق کے یہاں تعقید اور جلی تعقید کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً سودا کے اسی شعر کی نثر دیباسے عید کا مہ نو کسکی تمنائے ہم آغوشی میں ہاتھ پھیلاکر رہ گیا ہے) کو دیکھکر پھر انکے شعر کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بے ترتیبی الفاظ کی کوئی حد نہیں رہی ہے

میر ۔ تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے ؛؛ میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے

مصرعۂ ثانی "اپنے قاتل کے انداز کا کشتہ ہوں ہونا چاہیئے تھا مگر میر نے تعقید کیا تھا اسکو "اپنے انداز قاتل کا کشتہ ہوں" لکھدیا ہے، بالفاظ دیگر اپنے کا تعلق قاتل کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا گر بنائے تعقید لفظی بظاہر انداز کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی تعقید بغایت بدنما ہوتی ہے۔ خصوصاً فارسی ترکیب کیساتھ مثلاً

مومن ۔ صحرا میں جنوں کے مجھے نخچیر بناؤ ؛؛ دل کو مرے اسکا ہدفِ تیر بناؤ

تنہا ۔ وہ سر کسی مقتل میں پسندیدہ نہ ہووے ؛؛ زیرِ سُمِ اسپ اسکے جو غلطیدہ نہووے

"زیرِ سمِ اسپ اسکے" یعنی "اسکے اسپ کے سم کے نیچے" "اسکا ہدف تیر" یعنی اسکے تیر کا ہدف"

غالب ۔ وہ شہنشاہ کہ جسکی پئے تعمیر سرا ؛؛ چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

"جسکی پئے تعمیر سرا" یعنی "جسکی سرا کی تعمیر کے لئے"

رشک لکھنوی ۔ ایسی ہوئی تھی کونسی تقصیر تمہاری ؛؛ ہے گور ہماری ہدفِ تیر تمہاری

"ہدفِ تیر تمہاری" یعنی "تمہارے تیر کی ہدف"

اسیر لکھنوی ۔ زباں پہ وصفِ لب اسکا نہ جبتلک آیا ؛؛ اسیر لذتِ شیرینی زبان نہ اٹھی

"وصف لب اسکا" یعنی "اسکے لب کا وصف"

حیات بخش رسا ۔ بہرِ عیادت آئے وہ میری تو یہ کہا ؛؛ دیکھیں کسی کو کیا کوئی بیمار بھی تو ہو

لفظ میری کا تعلق عیادت کیساتھ ہے مگر بہرِ عیادت کی فارسی ترکیب کے درمیان میں اسکا آنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عیب تعقید کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ غالب کا

ایک شعر جو پہلے لکھا گیا اور دوسرا جو درج ذیل ہے۔ دونوں میں یہی سقم موجود ہے۔

غالب ۔ گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا ٭ ننگ سجدہ سے مرے سنگ آستاں اپنا

حسرت موہانی ۔ استقامت نہ ہوئی شوق کو ترا نصیب ٭ جب تک اس بت کے نہ زیر خم ابرو آیا

دوسرے مصرعے میں "کے" کو "زیر" کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ "خم" کے درمیان میں آجانے سے تعقید پیدا ہوگئی۔

میر سوز ۔ اک دن کبھی آ کلبۂ احزاں میں ہمارے ٭ غم دور ہو دل کا ترے برکت سے قدم کی

"ترے برکت سے قدم کی" یعنی "تیرے قدم کی برکت سے"۔ "سے" اور "کی" کے بیچ میں آنے سے تعقید پیدا ہوگئی۔

میر حسن ۔ منصور مجھے عشق کا تک مانیو احسان ٭ پستی سے بلندی کے تئیں دار نے کھینچا

پہلے مصرعے میں یہ جملہ "عشق کا تک مانیو احسان" بریکٹ کے اندر ہونا چاہیے۔ اس طرح ۔ منصور مجھے (عشق کا تک مانیو احسان) ٭ پستی سے بلندی کے تئیں دار نے کھینچا

اس جملے کے درمیان میں آجانے سے شعر میں عجیب تعقید ضرور پیدا ہوگیا ہے۔ مگر تحریر کے اس انگریزی اسلوب کا میر حسن کے قدیم کلام میں پایا جانا دلچسپی سے خالی نہیں۔

ولی ۔ اتنا نہیں کوئی کہ پکڑ آستین میری ٭ اس سے کہے کہ تجھ پہ یہ مائل عزیز ہے

"یہ" کو "عزیز" کے ساتھ یعنی "تجھ پر یہ عزیز مائل ہے" ہونا چاہیے تھا۔ "یہ مائل عزیز ہے" لکھنے سے تعقید پیدا ہوگئی۔

جرأت ۔ کیا کہیں دل کی تپش جب خفگی میں جرأت ٭ پاس سے ہو کے بھبھوکا وہ ہمارے نکلا

"ہمارے" کو "پاس" کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ ان دونوں کے درمیان فصل کے واقع ہو جانے سے تعقید لازمی طور پر پیدا ہوگئی۔

سالک دہلوی ۔ شوق ہے لوح مزار ہونے کو ٭ ہے کسی کا گذار ہونے کو

احسن مارہروی ۔ آنکھیں مری تلاش میں ہیں بام بتان کی ٭ فکر زمیں نہیں ہے رہ کر مجھے آسمان کی

یہاں بھی مصرعہ اول میں "کی" کو "تلاش" کے متصل ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہیں ہے اور اسی کا نام تعقید ہے۔

میر حسن ؎ اک وفاداری جو ہے آپ گل اپنی میرحسن :: پھر طبیعت نہیں پھرتی جدھر آجاتی ہے
مصحفی ؎ اُٹھ گیا ہے وہ ستم دیدہ کہیں مدت سے :: کچھ خبر مجکو دل اپنے کی نہیں مدت سے
میر ممنون ؎ کسی کے بدرقہ لطف ہے ہے چشم اُسکی :: جو اختیار ہے ممنون نے کی گناہ کی راہ
غالب ؎ ہیں لبکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے :: ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
ذوق ؎ نالہ ہے اُنسے بیان درد جدائی کرتا :: کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا
" ؎ وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تیمناً :: بنیاد میکدہ مری خشت لحد سے ہیا
" ؎ جھپتے ہیں یاں مزے روش نشۂ شراب :: ہوجاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ذوق کے یہ تینوں شعر تعقید لفظی کے بدترین نمونے ہیں۔ اس باب میں ذوق کی تقلید کسی کے لئے کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہوسکتی۔

(۵) حذف حروف مثل کو، ہی، تو۔ کا۔ وہ۔ پر۔ کرکے۔ جو۔ وغیرہ

ضرورت شعر کبھی کبھی شاعر کو بعض الفاظ کے حذف پر مجبور کردیتی ہے کہیں کہیں تو یہ بات بری نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اکثر موقعوں پر مذاق صحیح اس عیب کو کسی طرح گوارہ نہیں کرسکا مثلاً

ولی ؎ خوبیٔ اعجاز حسن یار اگر انشا کروں :: بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

"صفحۂ کاغذ کو ید بیضا کروں" لکھنا چاہئے تھا یہاں پر حرف کو کا حذف یقیناً قابل اعتراض ہے اس عیب کو ضرورت شعر کی بنا پر جائز سمجھنے والے قادر الکلامی کا دعویٰ کسی طرح نہیں کرسکتے والف، حذف حرف کو کی اور بھی چند قابل اعتراض مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

حضرت استاد جرات ؎ نہ تیغ یار سے گردن پھراؤں میں ہرگز :: کہ عین لطف سمجھتا ہوں میں جفائے حبیب
"عین لطف سمجھتا ہوں میں جفائے حبیب" یعنی "میں جفائے حبیب کو عین لطف سمجھتا ہوں"

راسخ عظیم آبادی ؎ سب تیرے طالب دیدار پریشاں پائے :: جنکو دیدار میسر تھا وے حیراں پائے
"وے حیراں پائے" یعنی "انکو حیراں پایا"

غالب ؎ جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو :: یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا
"جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو" یعنی "جلوۂ گل نے آبجو کو چراغاں کیا تھا"

شیفتہ ؎ اُٹھ صبح ہوئی مرغ چمن نغمہ سرا دیکھ :: نور سحر و حسن گل و لطف ہوا دیکھ

"مرغ چمن نغمہ سرا دیکھئے" یعنی "مرغ چمن کو نغمہ سرا دیکھئے"

میر کلو عرش ؎ اسنے پیامبر کو پیمبر بنا دیا ؛؛ خط وحی، جبرئیل کبوتر بنا دیا

"خط وحی جبرئیل کبوتر بنا دیا" یعنی "خط کو وحی اور جبرئیل کو کبوتر بنا دیا"

اشرف کمنڈوی ؎ حدیث وحشت دل سی بہکتی ہی زبان ؛؛ بناؤں رشتۂ تقریر بیڑیاں منہ میں

"منہ بناؤں رشتۂ تقریر بیڑیاں" یعنی رشتۂ تقریر کو بیڑیاں بناؤں۔

مائل دہلوی ؎ جو دیکھ جاؤ دل بیقرار کیا ہوگا ؛؛ چلے جو آؤ ادہر ایکبار کیا ہوگا

اس شعر میں دو خرابیاں ہیں اول تو "کیا ہوگا" کا موقع نہیں اسکے بجائے "تو کیا ہو" لکھنا چاہیئے تھا۔ دوسرے دل بیقرار کے بعد حرف "کو" کا حذف بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا

اقبال ؎ مجنون نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے ؛؛ نظارہ کی ہوس ہو تو لیلےٰ بھی چھوڑ دے

"لیلیٰ بھی چھوڑ دے" یعنی لیلیٰ کو بھی چھوڑ دے۔

اسمائے عام مثل بھیڑیا، شیر، کبوتر، تیر۔ اور بعض اسمائے خاص بیجان مثل لاہور، دہلی، سکندر نامہ۔ دیغرہم کیساتھ علامت مفعول کے لانیکی ضرورت نہیں ہوتی اور یوں کہتے ہیں کہ تمنے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے۔ شیر مارا ہے۔ کبوتر اڑایا ہے۔ تیر چلایا ہے۔ یا لاہور دیکھا ہے۔ دہلی دیکھی ہے۔ سکندر نامہ پڑھا ہے۔ مگر اسکے بالکل برعکس اسمائے خاص انسانی کیساتھ علامت مفعول "کو" لانا بہر حال ضروری ہے اور یوں بولتے ہیں کہ کیا تم نے امیر مینائی کو دیکھا ہے۔ جلسے میں گاندھی کو بلایا ہے۔ لارڈ ریڈنگ کو بائیکاٹ کر دیا تھا۔ بعض ناواقفان زبان جو اسمائے عام واسمائے خاص بیجان کے قیاس پر اسمائے خاص انسانی کے متعلق بھی علامت مفعول کے حذف کو جائز سمجھتے ہیں نہایت سخت غلطی کرتے ہیں۔ اقبال کی نسبت تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اہل زبان نہیں ہیں اسلئے "لیلیٰ کو بھی چھوڑ دے" کی جگہ "لیلیٰ بھی چھوڑ دے" لکھ گئے ہیں مگر مولانا حالی کو کیا کہیئے گا۔ جو حکیم محمود خان مرحوم کے مرثیے میں حکیم عبد المجید خان مرحوم کی نسبت لکھ گئے ہیں ؎

جمع ہوں محمود خان کی ذات میں انکی کمال ؛؛ ہے یہ سب ممکن مگر محمود خان ملنا محال

"محمود خان کے کمال انکی ذات میں جمع ہوں" اس فقرے کو بشکل مصرعۂ اول نظم کرنے میں عیب

تعقید جلی کے علاوہ ایک خرابی اور بھی پیدا ہو سکتی ہے وہ یہ کہ سرسری طور پر پڑھنے والا اسکو "جمع ہوں محمود خاں کی ذات میں انکے کمال" بھی پڑھ سکتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں "محمود خاں کا ملنا محال" کے بجائے "محمود خاں ملنا محال" لکھنا محض غلط ہے۔ یہ غلطی ویسی ہے جیسی ایک قدیم شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ جس نے سکندر اعظم کی نسبت لکھا ہے

؎ آپ کے روز جیا کس لئے دارا مارا۔

(ب) حذف ہے کی مثالیں۔

غالبؔ ؎ چشم بار روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے :: دیدۂ پرخوں ہمارا ساغر سرشار دوست

ثاقبؔ بدایونی ؎ تم وہ کہ بھولے پن میں تمہارے ہیں شوخیاں :: ہیں وہ کہ ہر کہ ہوش میں دیوانہ پن کی شاخ

غالبؔ اور ثاقبؔ دونوں کے مصرعہائے ثانی میں "ہے" کا حذف بلاشبہ معیوب ہے۔

اصغرؔ ؎ اتنا کہ اذن شورش و فریاد دیجیے :: مجھکو سوال کی نہ ضرورت جواب کی

دلِ ؎ گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی :: تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

اصغرؔ کے ایک شعر میں "ہے" اور دوسرے میں "ہیں" محذوف ہے۔

(ج) حذف "تو" کی مثالیں۔

حفیظ جونپوری ؎ کیوں مجھ سے ہر یہ منت کی تکرار کیا ہوا :: اچھا جو میں نے کر ہی لیا پیار کیا ہوا

"اچھا جو میں نے کر ہی لیا پیار کیا ہوا" یعنی "پیار کر ہی لیا تو کیا ہوا"

حیات بخش رسا ؎ آئے ہیں امیر جو زمانہ کا ہی قاتل :: یہ حضرت دل آپکی شامت نہیں کیا ہے

"آپکی شامت نہیں کیا ہے" یعنی "آپکی شامت نہیں تو کیا ہے"

(د) حذف "کا" کی مثال میں حالی کا شعر "محمود خاں ملنا محال" درج ہو چکا ہے۔ ایک شعر اور لکھا جاتا ہے۔

چکبستؔ لکھنوی ؎ فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا :: اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

اجل کیا ہے؟ "خمار بادۂ ہستی اتر جانا" یعنی خمار بادۂ ہستی کا اتر جانا۔ اردو کے مصادر مرکب کی ترکیب اگر دو سے زیادہ لفظوں سے ہوئی ہو تو اسکے درمیان میں حرف "کا" کا آنا ضروری ہوتا ہے گو دور حاضر کے بعض شاعر اسکی مطلق پروا نہیں کرتے۔ اور برا کرتے ہیں مثلاً

عزیز ~ اندھیرے منھ ادھر بیمار شام غم کا مرجانا ؞ ادھر وہ خود رخ پر تری زلفیں بکھر جانا

جگر مرادآبادی ~ سرہانے سے کسی کا اٹھ کے وہ پیچھے پھر جانا ؞ یکایک پھر مریض عشق کا چہرا اتر جانا

فانی بدایونی ~ ہے شانِ عبودیت مصروف دعا ہو جانا ؞ منظور مشیت تھا ہر نالے سا ہونا

زلفوں کا بکھر جانا ۔ چہرے کا اتر جانا ۔ نالے کا رسا ہونا ۔ لکھنا چاہیے تھا۔

(ھ) حذف وہ کی مثالیں ۔

غالب ~ وائے محرومی تسلیم و بدا حال وفا ؞ جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں

" ~ گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو ؞ شکوہ جور سے سرگرم جفا ہو جاتا ہے

جانتا ہے یعنی وہ جانتا ہے ۔ سرگرم جفا ہوتا ہے یعنی وہ سرگرم جفا ہوتا ہے ۔

میر حسین تسکین ~ ایسی ہے غیر کی خاطر کہ مرے حال کو سن ؞ دل میں روتے ہیں پہ ظاہر میں ہنسے دیتے ہیں

روتے ہیں اور ہنسے دیتے ہیں ۔ یعنی وہ ہنسے دیتے ہیں ۔

نجم اکبرآبادی ~ پردہ الٹ کے بزم میں ہنگامہ کر دیا ؞ محشر طراز ہو گئے محفل طراز سے

"محشر طراز ہو گئے محفل طراز سے" یعنی وہ محفل طراز سے محشر طراز ہو گئے ۔

جگر مرادآبادی ~ لب پہ نالہ نہیں شکوہ نہیں فریاد نہیں ؞ پھر بھی کہتے ہیں کہ تو لائق بیداد نہیں

پھر بھی کہتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں ۔ اگر یہ مطلع یوں ہوتا تو یہ خرابی دور ہو جاتی

~ لب پہ یاں شکوہ نہیں نالہ و فریاد نہیں ؞ پھر بھی وہ کہتے ہیں تو لائق بیداد نہیں

(و) حذف پر کی مثال

محمد عیسیٰ تنہا ~ جان قالب سے نکلی جاتی ہے اپنے تنہا ؞ جب میں سنتا ہوں کہ وے آج سفر جاتے ہیں

سفر جاتے ہیں یعنی سفر پر جاتے ہیں یا سفر کو جاتے ہیں ۔

(ز) حذف کر کی مثالیں ۔

مصحفی ~ کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہ گیا ؞ کچھ وہ بھی مجھکو دیکھکے حیران رہ گیا

"پہچان رہ گیا" یعنی پہچان کر رہ گیا ۔

ہوش ~ تو جو گزرا در زنداں سے تو کس حسرت سے ؞ رہ گیا دور سے تجھکو ترا زندانی دیکھ

"دیکھ" یعنی دیکھکر ۔

(ح) حذف "کے" کی مثالیں۔

میرؔ ؎ گل کیا جسے کہیں کہ گلے کا تو ہار کر ۔۔ ہم پھینکدیں اُسے ترے منھ پر نثار کر
"ہم پھینکدیں اُسے ترے منھ پر نثار کر" نثار کر یعنی نثار کر کے۔

میر حسنؔ ؎ کل جو تم ادھر سے گزرے ہم نظر کر رہ گئے ۔۔ جی میں تھا کچھ کہئے لیکن آہ ڈر کر رہ گئے
نظر کر رہ گئے یعنی نظر کر کے رہ گئے۔

مصحفیؔ ؎ منھ پھیر کر جب چلا وہ مجھسے ہنگام وداع ۔۔ اسکے چہرے پر میں حیرت کی نظر کر رہ گیا
نظر کر رہ گیا یعنی نظر کر کے رہ گیا۔

شہیدیؔ ؎ عشق میں کم تر ہنسے اور بیشتر رو دیا کیے ۔۔ ایک شب کا لطف برسوں یاد کر رو دیا کیے
یاد کر یعنی یاد کر کے حذف "کے" کی مذکورہ بالا کل مثالیں زبان قدیم کیساتھ مخصوص ہیں آجکل کوئی ایسا نہیں لکھتا۔

ثاقب لکھنوی ؎ کوئی صحرا سے محشر تک خبر ہوگا دکیمہ ہی لینگے ۔۔ ڈر ہی گیا جنون فتنہ سامان دیکھنے والے
"ڈر ہی گیا جنون فتنہ سامان دیکھنے والے" یعنی جنون فتنہ سامان کے دیکھنے والے

(ط) حذف "جو" کی مثال

نوگی دہلوی ؎ تماشا عام ہوگا اور کیف بیخودی ارزان ۔۔ عجب کیا ہے قیامت صحبت مستانہ ہو جائے
اگر مصرعہ ثانی میں "جو" کیساتھ "محشر" کا لفظ لکھدیا جائے تو یہ عیب رفع ہو جائے۔ ملاحظہ ہو
؎ تماشا عام ہوگا اور کیف بیخودی ارزان ۔۔ عجب کیا ہے جو محشر صحبت مستانہ ہو جائے
حذف "کا" و حذف "کو" کی چند اور مثالیں جو محشر لکھنوی کے کلام میں تحریر مضمون کے بعد نظر سے گزریں ذیل میں درج کیجاتی ہیں۔

محشرؔ ؎ نہ دیکھی فال لے مونس بیاض لن ترانی میں ۔۔ کہ تا حد سوال شوق ممکن ہے نظر جانا
ولہٗ ؎ ناامیدی میں شب وعدہ سحر ہو جاتا ۔۔ وہ نہیں لکھا تھا مری عمر بسر ہو جانا
؎ وفا حاصل زندگی جانتے ہیں ۔۔ جفاؤں پہ تیری فدا ہونے والے
"وفا حاصل زندگی جانتے ہیں" یعنی "وفا کو حاصل زندگی جانتے ہیں" "ممکن ہے نظر جانا" یعنی نظر کا جانا "مری عمر بسر ہو جانا" یعنی میری عمر کا بسر ہو جانا۔

(۴۶) "ی" کا دب کر نکلنا

واضح ہو کہ اُردو زبان میں حروف علت یعنی واؤ۔ الف اور "ی" کا گرنا یا دب کر نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ شیخ ناسخ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانے میں جو ہدایتیں کی تھیں انہیں سے ایک یہ بھی تھی کہ کلمے کے آخر میں سے الف۔ واؤ۔ ی کو دبا گرا دینا اچھا نہیں مگر بقول مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی[1] شیخ کی اس وصیت پر کسی نے عمل [illegible] لفظوں کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر مصرع میں بھر دینا اُردو شاعری میں [illegible] غالباً شیخ کا منشا یہ اس بنا پر تھا کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ کسی ذیرفی میں سے "ی" کو گرا دیں: گفتگو وشکست وشو میں سے واؤ اور دریا دگویا کا الف ساقط ہو جانے دیں: غالباً شیخ ناسخ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ حروف علت کسی حالت میں دبکر نہ نکلیں بلکہ غرض یہ ہے کہ جن حروف کا گرنا جن الفاظ میں گراں معلوم ہو انھیں نہ گرانا چاہیے۔

مثلاً۔ میں۔ سے۔ کو۔ کے۔ کا۔ تو۔ جو وغیرہ اُردو حروف اور افعال ناقصہ مثل تھے اور تھا میں حروف علت کا گرانا جائز ہے البتہ الفاظ خصوصاً فعل میں ان حروف کا گرانا یا دب کر نکلنا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

میر ؎ وہ کہاں دھوم جو دیکھی گئی چشم تر سے :: ابر کیا کیا اٹھے ہنگامے کیا کیا برسے

یہاں جو اور سے حروف میں واؤ اور "ی" کا سقوط جائز لیکن اٹھے فعل میں "ی" کا دب کر نکلنا معیوب ہے۔

سودا ؎ نہ ہوا کہ تو صلاح نیک ان دونوں میں کیا :: جام کا بوسہ لیتی یا جو ہیں لب پیالہ تم

تنہا ؎ دی اسکی زلف کو سنبل سے نسبت لے تنہا :: صد آفریں ہے تیرے [illegible]

شاہ نصیر ؎ جائے تحسین ہے پیالے ترے بیمار کی بات :: مر گیا پر نہ لبوں پر شکوہ سے اٹھا کی بات

غالب ؎ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل :: دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ولی ؎ اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی لاش :: دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

تسلیم لکھنوی ؎ مشکل جو ہر تھا گرفتار میں تلوار دل میں :: عمر اپنی کٹی دنیا کے ستمگاروں میں

ان کل اشعار میں افعال لیتی۔ دی۔ کی۔ کھلے۔ اٹھائی۔ اور کٹی میں "ی" کا ساقط ہونا یا دب کر نکلنا یقیناً معیوب ہے۔

---

[1] رسالہ اُردوئے معلیٰ علیگڑھ بابت جولائی [illegible] صفحہ ۱۵

شاہ نصیر کے شعر میں یہ بات ملاحظہ طلب ہے۔ کہ مصرعہ اوّل میں کی حرف ہے اسلئے یہاں ی کا سقوط برا نہیں معلوم ہوتا مگر مصرعہ ثانی میں کی جزوِ فعل ہے اسلئے اس موقع پر ی کا گرنا صریحاً معیوب معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے دوسرے شعر کی شرح کرتے ہوئے مولوی علی حیدر صاحب نے ایک اور نکتہ بہت لطیف بیان کیا ہے وہ یہ کہ "اگر ایک مصرع میں یائے معروف و یائے مجہول دونوں جمع ہوں اور ان میں سے ایک کا گرانا کافی ہو تو یائے مجہول کو گرانا اور یائے معروف کو باقی رکھنا چاہیے مثلاً غالب کا یہ مصرع۔
اس رنگ سے اٹھائی کل اُسنے اسد کی لاش :: اسکو یوں کہنا بہتر تھا کہ اس رنگ سے کل اُسنے اُٹھائی اسد کی نعش"

الفاظ خصوصاً فارسی الفاظ رائج میں بھی ی کا گرانا معیوب ہے۔ مثلاً

اختر شاہ اودھ ــ گلابی اس پہ گلا کاٹے ایسا پسند ہے تو :: مجھے بھی مستی میں اسے بادہ خوار لیتا جا
آتش ــ موجد اسکی ہے یہ سیہ روزی ہماری آتش :: ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شب ہجراں پیدا
مہر لکھنوی ــ بیداری میں ہے آپکا حال اور طرح کا :: ہاں خواب میں رہتا ہے خیال اور طرح کا
تسلیم ــ اہلِ وفا و ولولے آہ و فغاں کے ہیں :: دنیائے عشق میں بڑے نام آسمان کے ہیں
جگر مرادآبادی ــ یہ نہیں تیری آرزو نہ کرے :: دل مگر خالی ہائے وہ ہو نہ کرے
فانی بدایونی ــ مشکل مرے مرنے کی مشکل ہے کہ آساں ہو :: کچھ نازکی قاتل کی کچھ اپنی گرانجانی

ان اشعار میں الفاظ گلابی ۔ مستی ۔ سیہ روزی ۔ بیداری ۔ خالی ۔ نازکی ۔ بڑے ۔ میں ی کا دبکر نکلنا اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔ اردو الفاظ میں حروف کے علاوہ بعض اسمائے ضمائر مثلاً میری، تیری ۔ مجھے ۔ اُسے ۔ وغیرہ کو اس کلئے سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے کہ ان میں ی کا دبنا عام طور پر رائج ہے ۔ اور معیوب نہیں سمجھا جاتا ۔

(۷) واؤ کا دب کر نکلنا

تنہا ــ کوچے میں ترے ہم بھی گذر کرتے تھے گاہے :: اور وان کی زمیں سر و رو کے تر کرتے تھے گاہے
غالب ــ تم انکے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب :: یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

رو اور کہو فعل ہیں اسلئے انمیں واؤ کا دبکر نکلنا بلا شبہ معیوب ہے ۔ افعال کے علاوہ اُن مستثنیات کو چھوڑ کر جنکا ذکر عنوان ۷ کے تحت میں ہو چکا ہے ۔ الفاظ میں بھی سقوط واؤ عموماً

اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً

غافل ۔ غازہ سے فروزاں رخ پرنور نہ ہو جائے :: ڈرتا ہوں پری سے تو کہیں حور نہ ہو جائے

شادان ۔ گستاخ ہوکے یار سے شاداں نے یہ کہا :: پہلو سے میرے اٹھ بیٹھئے ۔ بے نگار ہے

مومن ۔ سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر :: یوں روئے زار زار تو آئے عزا کیا تو

[illegible] لکھنوی ۔ زانو پہ سر رکھ کے جب وہ سو رہا :: عیش بے پایاں مرے دل کو ملا

تسلیم لکھنوی ۔ کس لئے چارہ گر درد تو تدبیر میں ہے :: ہو رہےگی کبھی صحت بھی جو تقدیر میں ہے

عزیز لکھنوی ۔ ہمہ تن محو ہو گئے کہ تو خود بینی میں :: آئینہ بھی ترا منظر اصلی نہ ہوا

تاجور ۔ سخت جاں ہوں میں تجھ موم نہ کر دے دل تو سہی :: تیر یاں مجھے بہت نہ فر قو ادا

بعض الفاظ جو حرف ن پہ ختم ہوتے ہیں انمیں اس ن سے قبل کے واؤ کا دبنا بھی اور تبدیلی کے نزدیک مناسب نہیں ہوتا۔ مثلاً

میر ممنون ۔ نام بھی اپنا بہت ہیں تنگ سنا ہو ممنوں اب وہ خلق جہاں تک تنگ ہو مری بود و باش

[illegible] ۔ قلقل صدا لئے ہوئی محو مستوں کو :: کار مسیح ساقی میخوار نے کیا

ضامن کنتوری ۔ دل ناداں کی ہوس کا ریوں سے کیا ہوگا :: انکو منظور جو ہوگا وہی اچھا ہوگا

حسرت موہانی ۔ حسرت بہت ہے مرتبہ عاشقی بلند :: تجھکو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

(۸) الف کا دبکر نکلنا

سودا ۔ دیکھا نہ حال سودا کا کوچے میں عشق کے :: اے دل تو عاشقی کا نہ لے نام کچھ نہیں

اشرف لکھنوی ۔ بیان آسیا گردش ہے بخت کو ہر دم :: پہنچے دیگانہ دانا بھی آسماں سے میں

محشر ۔ ضبط فغاں سے دہر میں سناٹا چھا گیا :: کی آہ جب تو شور قیامت بپا ہوا

یہاں الفاظ سودا ۔ آسیا ۔ سناٹا میں تقصیر الف معیوب ہے ۔ اور افعال میں معیوب تر۔ مثلاً

میر حسن ۔ آنکھوں کو اسکی دیکھا تو مستی نظر پڑی :: پھر بعد اسکے بادہ پرستی نظر پڑی

اسیر ۔ دل کھنچا جاتا ہے اس تیغ مصفا کی طرف :: بشیر شیر ہوا کرتا ہے دریا کی طرف

نسیم دہلوی ۔ رحم آجاتا ہے دشمن کی پریشانی پہ :: زخم خوں روتے ہیں شمشیر کی عریانی پر

بحر لکھنوی ۔ للہ کوئی امر نہ ہمسے ہوا اسے بحر :: ناکام رہے کچھ نہ کیا کام خدا کا

عبداللہ خان مہر سے خط آیا آ د خطِ رخسارِ بہار کا ٭ لکھا مٹائیے ورقِ انتشار کا
ذکی دہلوی سے یہ مانا کہ ہیں لائقِ صحبت نہیں لیکن ٭ اتنا تو سمجھئے کہ کبھی غیر کبھی آپ
بیخود دہلوی سے پھر کوئی تازہ مصیبت نہ ہو یا رب ٭ آج ٹھہرا ہوا ہے کچھ دلِ مضطر اپنا
رضا علی وحشت سے چلا جاتا ہے کاروانِ نفس ٭ نہ بانگِ درا ہے نہ صوتِ جرس
ء سے نہیں کہ عشق نہیں ہے گلِ یاسمن سے مجھکو ٭ دل فسردہ لئے جاتا ہے چمن سے مجھے
حیات بخش رسا سے جب دیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گزر نہیں ٭ کعبے کے جانیوالوں میں مجبور جا ملے
فانی بدایونی سے بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرے سن نہ جیتے ہیں ٭ در دیر خدا کی مار میں رہ گیا ہو کر
عزیز لکھنوی سے ہجومِ شوق کا بھی قصہ مختصر یہ ہے ٭ کہیں جو چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا
جگر مرادآبادی سے پھونکا تمام جسم دل وا عذار نے ٭ مجھکو خزاں بنا دیا میری بہار نے
دلی سے بیگانگی و عشق میں بس فرق ہے اتنا ٭ جب درد نہیں ملتا تھا اب دل نہیں ملتا
اصغر گونڈوی سے کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم ٭ کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
داغ سے لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے ٭ رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

بعض اسمائے ضمیر مثل مری۔ تری وغیرہ کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ انمیں "ی" کا دبنا ناگوار نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات الف کی نسبت نہیں کہی جا سکتی تقصیرِ الف اسمائے ضمیر میں بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مثلاً

اسیر سے گرائی جو کسی نے تو گرایا مرا خون ٭ شیشہ توڑا جو کسی نے تو مرا دل توڑا
ثاقب لکھنوی سے اسقدر گھر مرا آباد ہے ویرانی سے ٭ دیکھتا ہوں در و دیوار کو حیرانی سے
ثاقب بدایونی سے کربلا پر مرا سر آنکھ نجف پر میرے ٭ دل مدینے پہ فدا جان نثار بغداد
اشرف کسمنڈوی سے سرگوشیاں تیرے دل میں جان گئی ہم ٭ پردے ہوئے تیرے تو پہچان گئے ہم
مشیر سے رقم کریں غزل تازہ طرزِ میر میں ہم ٭ شراب کا مزا اس آبِ خوشگوار میں ہے

دوسرا مصرعہ اگر اسطرح ہوتے مزا شراب کا اس آبِ الخ تو یہ عیب دور ہو جائے۔

(۹) نقص روانی قسم اول عمومی

شعر میں روانی کا نقص بھی ایک بڑا عیب ہے جسکی ناگواری مسلم ہے۔ اس کی کئی صورتیں عام طور پر نو مشق شعرا کے کلام میں اور کبھی کبھی پختہ مشق اساتذہ کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہیں۔

پہلی صورت یہ کہ شعر میں الفاظ یکے بعد دیگرے ایسے جمع ہو جائیں کہ انکا زبان سے روانی کیساتھ نکلنا ممکن نہو۔ مثلاً

غالب — حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی :: عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ [illegible]

مصرع ثانی میں پُر عربدہ کی اور گوں یہ چار دل لفظ پے در پے اس قسم کے [illegible] کہ صفائی اور روانی کیساتھ زبان سے بے تکلف ادا نہیں ہو سکتے۔

غالب — ہے رنج بیتابی کسطرح اٹھایا جائے :: داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں [illegible]

مصرع ثانی میں پشت دست عجز کی یکجائی نے صریحی طور پر روانی کا نقص پیدا کر دیا ہے۔

حفیظ جونپوری — ہو مالکِ کوثر کا نواسا پیاسا :: دریا ہو خشک خاک [illegible]

مصرع ثانی میں ہو اور خشک نیز [illegible] اور آب کی یکجائی [illegible] واقع ہوئی ہے۔

نظم طباطبائی — شغل خود بینی تھا شانِ بزم آرائی نہ تھی :: جلوہ گر تھا یار اور چشمِ تماشائی نہ تھی

مصرع اول میں بزم کیساتھ آرائی کے جوڑ میں روانی کا نقص [illegible] بجائے اگر محفل کا لفظ لکھدیا جائے تو یہ نقص بآسانی رفع ہو سکتا ہے۔

شغل خود بینی تھا شانِ محفل آرائی نہ تھی

دوسری صورت — یہ کہ درمیان شعر میں اور کا لفظ داخل ہو کر روانی کا نقص [illegible] بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اور کسی شعر میں آئے اور اس سے خرابی نہ پیدا ہو۔ مثلاً

میر سوز — خانہ بدوش اور ازل سے غریب تھا :: دل کا [illegible]

حسرت — آشنا ذرا تو سے مست میں تو ہو گیا نہیں نگہ ساقیا :: [illegible]

مصرع ثانی میں موجودگی لفظ اَبر کی خرابی کے علاوہ نہ کے بجائے نہیں کا استعمال بھی قابل اعتراض ہے۔ اگر مصرع بدلکر "اب رہا مجھ میں نہ کچھ ہے کا نہ پہچاننے کا ہوش" کردیا جائے تو دونوں خرابیاں دور ہوجائیں۔

جرأت ؎ قد ہے قیامت اور غضب گات آپکی ؛ جو بات ہے سو قہر ہے کیا بات آپکی

غالب ؎ ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا ؛ ہوگیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

غالب ؎ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ ؛ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

لطافت ؎ قتل کو ہائے وہ کمسن وہ ستمگار اُٹھے ؛ نہ کماں جس سے اٹھے اور نہ تلوار اٹھے

اگر مصرع ثانی اسطرح کردیا جائے "نہ کماں جس سے اُٹھے جس سے نہ تلوار اُٹھے" تو روانی کا نقص نہ رہے۔

جلیل ؎ آنکھ سے آنکھ ملانے کا یہ انجام ہوا ؛ غم ترا مجھکو ملا اور مرا دل تجھکو

وحشت ؎ قدیم خادم بزم شراب ہوں وحشت ؛ نثار شیشہ ہے دل اور سر فدائے قدح

مصرع ثانی اگر یوں کردیا جائے: "نثار شیشہ مرا دل ہے سر فدائے قدح" تو شعر کی کمزوری جاتی رہے۔

حسرت موہانی ؎ ہم تھے بیباک اور وہ محجوب ؛ شب عرض لطف بحساب اُٹھا

دیوان حسرت کے دوسرے اڈیشن میں نقص روانی کو رفع کرنیکی غرض سے پہلا مصرع بدلکر یوں کردیا گیا ہے "ہم تھے بیباک یار تھا محجوب"

جگر مرادآبادی ؎ غم تمہارا وہ کہ سب کچھ اور پھر کچھ بھی نہیں ؛ دل ہمارا یہ کہ ہر بربادی بھی آباد بھی

پہلے مصرع میں "اور" کی جگہ "ہو کے" بنادیا جائے تو ساری خرابی دور ہوجائے۔

تیسری صورت میں پہلی صورت کی خرابی کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ مصرع کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ہر ٹکڑے کا مضمون نا تمام سمجھا تا ہے۔ مثلاً

میر سوز ؎ صد شکر کہ داغ دل افسردہ ہوا اپنا ؛ یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جلتا

یہاں پہلے مصرع میں داغ اور دل اور دوسرے مصرع میں بھڑکتا اور تو کو ساتھ ملاکر پڑھنے میں روانی باقی نہیں رہتی۔ یہ بجائے خود ایک عیب تھا اسپر طرہ یہ ہوا

کہ دونوں مصرعے ٹکڑے ٹکڑے ہیں اور دونوں میں پہلے ٹکڑے کا مضمون ناقص ہوگیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے کو ملائے بغیر پورا نہیں ہوتا

شیدائیان حسن کلام کو لازم ہے کہ نقص روانی کے مندرجہ بالا ہر سہ اقسام سے حتی الامکان پرہیز کی کوشش کریں۔

(۱) نقص روانی قسم دوم خصوصی موسوم بہ ضعف خاتمہ

نمبر (۹) میں شعرائے متقدمین سے لیکر متوسطین و متاخرین بلکہ معاصرین تک کے کلام سے مثالیں دی گئی ہیں اُنکو دیکھکر نقص روانی کی حقیقت غالباً ناظرین کے ضرور ذہن نشین ہوگئی ہوگی۔ روانی کا یہ نقص جب کسی مصرع کے آخر میں واقع ہوتا ہے۔ تو مزید ناگواری کا موجب ہوجاتا ہے اور ضعف خاتمہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

اسکی مثالیں بھی متقدمین۔ متوسطین۔ متاخرین۔ اور معاصرین کے کلام سے ذیل میں درج کیجاتی ہیں:۔

خواجہ میر درد ؎ کون سا دل دہی کہ جسمیں آہ :: خانہ آباد تونے گھر نکیا

میر حسن ؎ شیشہ خالی نہیں ہوتا ہے نہ تھمتے ہیں اشک :: کیسے روتے ہیں دل خون شدہ کو بیٹھے ہم

ہوس ؎ قیس آوارہ کی غربت میں کٹی ساری عمر :: پر فلک نے نہ اُسے روئے وطن دکھلایا

جسمیں آہ۔ تھمتے ہیں اشک۔ کو بیٹھے ہم۔ اور ساری عمر۔ میں یونہی روانی کا عنصر مفقود تھا اسپر طرہ یہ ہوا کہ یہ الفاظ مصرعوں کے آخر میں واقع ہیں جس نے اُن کے نقص کو اور بھی نمایاں کردیا ہے۔ ہوس کے شعر میں "ساری عمر" کے بجائے اگر "عمر تمام" لکھدیا جائے تو ضعف خاتمہ کا عیب دور ہوجائے۔

عیشی ؎ دیکھکر عیشی آوارہ کی سرگردانی :: بھول جائیگی چلن گردش ایام اپنا

" ؎ میں نے عیشی سے جو پوچھا دل پرخون کا حال :: اک صراحی سے گلگون کی بھری دکھلائی

ممنون ؎ چاندنی مار گئی اس دل زخمی کو رات :: پر ترا اندازہ یہ کسکا رخ پرنور ہوا

تنہا — صدقے اس کشتے کی ہمت کی کہ وہ بعد از قتل :: ہاتھ سے دے نہ کبھی گوشۂ داماں اپنا
اسیر — عشق بازی کی یہ خو ہے کہ لگی دل پہ چوٹ :: چلتے پھرتے جو کوئی صورت زیبا دیکھی
[illegible] — لگ گئی چپ سی جو تجھ کو سبب سکا نہیں اور :: بات اتنی ہے کہ وہ بات نہیں کرتے ہیں
انشا — آج عاشق کو ترے قبر میں رکھتے ہیں لوگ :: دفن اک زلزلہ ہوتا ہے زمیں کی تہ میں
غالب — نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب :: لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
[illegible] — اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا :: ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
مجروح — دل لگانے کے ہیں اسی سے لطف :: جان سے بھی ہمیں سوا ہے عشق
"لطف" کے بجائے اگر "مزے" کر دیا جائے تو پہلے مصرع سے ضعف تالیف کا عیب جاتا ہے
سالک دہلوی — صبر سے سہل گزر جائینگے دن ہجراں کے :: سالک انسان کو لازم نہیں مضطر ہو
اگر "دن ہجراں کے" کی جگہ "ایام فراق" کر دیا جائے تو پہلے مصرع کے ضعف تالیف میں یقیناً تخفیف ہو سکتی ہے۔
داغ — میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ ہے کیا یہ بات :: وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجھ کو
پہلے مصرع میں "ہے کیا یہ بات" کی جگہ "یہ بات ہے کیا" ہوتا تو بہتر ہوتا۔
نوح ناروی — صورت نقش قدم مٹ کے تو کیا حاصل :: اپنے موقع سے ہے دنیا میں ابھرنا اچھا
وحشت — بہ رنگ سبزہ بیگانہ ہیں ہم آشنائے گل :: ہماری سرفرازی ہے ہماری پائمالی
"آشنائے گل" کے بجائے "آشنائے گل ہے" ہوتا تو ضعف تالیف کا نقص نہ پیدا ہوتا
وحشت — کچھ اس طرح سے بگاڑا تھا میں نے اپنا کام :: کہ پھر وہ بن نہ سکا اور میں بنا نہ سکا
"اپنا کام" کی جگہ "کام اپنا" کر دیا جائے تو پہلے مصرع کی خرابی دور ہو جائے۔
مائل دہلوی — عظمت کعبہ مسلم ہے مگر میکدے میں :: ایک آرام یہ کیا ہے کہ کچھ دور نہیں
عزیز لکھنوی — ہوئی پیمائش راہ محبت بعد میرے جب :: مسافت ایک منزل کی ہے ہر نقش قدم میرا
اصغر گونڈوی — مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمی حسن شمع :: اس سے بھی زیادہ ہے سوز غم پروانہ
جگر مرادآبادی — سب ہو گئے اٹھ اٹھ کر اکبار نثار شمع :: پروانوں نے کیا جانے کیا وقت سحر دیکھا
فانی بدایونی — ازل میں خلق ہوئی تھی جو چھلبلوں کی روح :: تری نگاہ مری جان بیقرار ہوئی

(۱۱) تشدید یائے معروف بحالتِ اضافت

اضافت کی حالت میں یائے معروف کی تشدید مسلم طور پر معیوب سمجھی جاتی ہے مگر ہر عہد کی شاعری میں اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

ولی ؎ ہے قد ترا سراپا معنیٔ ناز گویا ✽ پوشیدہ دل میں میرے آتا ہے راز گویا

میر ؎ رازِ پوشیدگیٔ عشق ہے منظور ✽ آنکھیں رو رو کے تر کریں کیونکر

درد ؎ مست ہوں پیر مغاں کیا مجھ کو فرماتا ہے تو ✽ پابوس خم کروں یا دست بوسیٔ سبو

مرزا علی لطف ؎ ہوا اس شدت سے رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا ✽ کہ بھولا عندلیبوں کو گل گلزار کا چرچا

مصحفی ؎ کسی اپنے دشمن پہ یارب نگزرے ✽ جو مجھ پر جدائیٔ یاراں سے گزرا

محمود ؎ بیہوش پاس کہ محمود تصویر ہے بالیں پر ✽ سبھوں کے ہوئے ساقی پر جما آیا

آتش ؎ قامتِ یار ہے بانیٔ قیامت آتش ✽ فتنہ پردازیاں اس چشم کی ایجاد ہیں سب

" ؎ شباب تک نہیں پہونچا ہے عالمِ طفلی ✽ ہنوز حسنِ جوانیٔ یار راہ میں ہے

بحر ؎ افسوس سواریٔ صنم گور پہ آئی ✽ جب مر گئے تب زیست کی صورت نظر آئی

ماہر لکھنوی ؎ جوش زن چشم میں آنسو ہوں تو کیا آہوں سے ✽ تموج کس بحر میں تیزیٔ ہوا سے ہوا

داغ دہلوی ؎ موجِ طوفانی و گردابِ محیط ✽ اپنی کشتی کس طرح بچ کر چلے

محشر ؎ عدم کے رہروؤں کو خوابِ مرگ آ جائے جلدی سے ✽ کہانی چارہ ساز چھیڑ دو دوریٔ منزل کی

نظم طباطبائی ؎ جب بڑھے دستِ دعا جانبِ ساقیٔ ازل ✽ بھر گئے بادۂ مقصود سے چلو میرے

جگر مرادآبادی ؎ وارفتگیٔ شوق کا اللہ رے کمال ✽ جو بے خبر ہوا وہ بڑا باخبر ہوا

(۱۲) "و" معروف اور "و" مجہول کا قافیہ

واؤ معروف اور واؤ مجہول کا قافیہ بھی معیوب سمجھا جاتا ہے مگر اسکی بھی مثالیں متاخرین تک کے کلام میں پائی جاتی ہیں معاصرین کا کلام البتہ اس عیب سے پاک نظر آتا ہے۔

شاہ حاتم ؎ کیا اسکی صفت میں گفتگو ہے ✽ جیسا تھا وہی ہے جو ہے سو ہے

میر ؎ فرصت میں یک نفس کی کیا دردِ دل سنو گے ✽ آئے تو تم ولیکن وقتِ اخیر آئے

ولی ـــہ دلی میں ابکی آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا ۔ کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

میر سوز ـــہ اے نکہت گل جا پو محفل میں کسی کی ۔ ٹک دل کو مرے ڈھونڈھیو تو دل میں کسی کے

واؤ معروف اور واؤ مجہول کی طرح یائے معروف و یائے مجہول کا قافیہ بھی صحیح نہیں ہوتا اس مطلع میں محفل مؤنث ہے اور دل مذکر لیکن سوز نے کسی کی اور کسی کے میں فرق نہیں رکھا ہے ۔

میر حسن ـــہ مجھے بھیجا ہے اُسنے کام کو تدبیر آج اپنے ۔ کوئی اسلام مجھے دیکھے کہ کیا مغرور جاتا ہوں

ـــہ گلی میں اُسکی آمد شد حسن خالی نہیں غم سے ۔ دل پُر درد آتا ہوں سر پُر شور جاتا ہوں

قائم ـــہ کوئی مختار کہو یا کوئی مجبور کہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں جہانتک کہ سبھی معذور ہیں

پاؤں بھی اپنے ٹھہرتے نہیں مانند سرشک ۔ دیکھیں لیجائے کدھر یہ سر پُر شور ہمیں

دلا ـــہ نے ہجر چاہتا ہوں نہ وصل حبیب کو ۔ یارب کہیں ہو صبر دل ناشکیب کو

اس مطلع میں قائم نے بھی میر سوز کی طرح یائے معروف و مجہول میں فرق نہیں رکھا ہے ۔

شاہ نصیر ـــہ حسن نمکین کا یہ تیرے شور پڑا ہے ۔ دامان خجالت بہ رُخ حور پڑا ہے

ناسخ ـــہ مجھکو تو یار سے ہے ہم آغوشی کا خیال ۔ وا ہے میرے اشتیاق میں آغوش گور ہے

معشوق سے ہے دل کے عوض طالب جفا ۔ ناسخ بھی عاشقوں میں بڑا بے شعور ہے

غالب ـــہ گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو ۔ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

گفتگو میں واؤ معروف ہے اور کہو میں واؤ مجہول مگر غالب نے ان دونوں کا قافیہ جائز رکھا ہے

سالک دہلوی ـــہ جوش ہے دل سے لب تک نالۂ پر شور کا ۔ پھر ہے سینے میں ماتم ہر دل مغفور کا

ذکی دہلوی ـــہ عطا کر اپنے کرم سے وہ خاطر مہجور ۔ کہ ایک حال فراز و نشیب ہو یارب

شب فراق میں ہر دم ہو یہ جانکنی ۔ وصال وصل صنم ہی نصیب ہو یارب

اشرف گسمنڈوی ـــہ ہم نہیں وہ فرق ہو کیونکر نہ ہر دستور میں ۔ خود غلط ہیں اشتیاق دلبر مغرور میں

بعد مردن بھی نہ تاثیر سیہ بختی گئی ۔ تیرگی ہے کس قیامت کی سواد گور میں

(۱۳) و (۱۴) ترکیب فارسی میں "ن" کا اعلان یا اسکے برعکس

فارسی کے جو الفاظ اردو زبان میں عام طور پر رائج ہیں اُنکے متعلق دستور ہے:

اگر وہ بلا اضافت ہوں تو رواج اہل زبان کے خلاف انہیں "ن" کا اعلان کیا جاوے لیکن ترکیب فارسی میں اعلان "نون" جائز نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً صرف مکاں یا جاں کہنا ہو گا تو مکاں اور جاں اعلان نون کیساتھ بولینگے جسکی کتابت کیلئے ن کے پیٹ میں نقطہ دینا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر آفتِ جاں یا رگِ جاں کہنا ہو گا تو آفتِ جاں اور رگِ جاں میں ترکیب فارسی کی موجودگی کے باعث اعلان نون جائز نہو گا۔ اور کتابت میں نون بے نقطہ لکھا جائیگا۔ مگر اکثر شاعر ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھتے اور جہاں اعلان نون نکرنا چاہیئے وہاں کرتے ہیں اور جہاں کرنا چاہیئے وہاں نہیں کرتے۔ مثلاً

میر حسن — درد فراق زخم جگر داغ دل حسن :: کیا کیا ہمیں نہ دہ گل خنداں دیکھا

ولی — محشر کا بھی دن کم نہیں آفت سے ولیکن :: کرتی ہے قیامت شب ہجراں بہت کچھ

مصحفی — آویزۂ لعل اُسکا جو ہیں کان میں دیکھا :: صد لخت جگر دیدۂ گریاں میں دیکھا

" — پہنے ہوئے دیکھا! ہے اُسے سرخ جو جامہ :: ہے وحلہ خوں تا بگریباں ہا اسے

مندرجہ بالا اشعار میں گل خنداں۔ شب ہجراں۔ دیدۂ گریاں۔ اور تا بگریباں میں اعلان نون نہونا چاہیئے تھا مگر ہے۔ اسکے بالکل برخلاف کہیں کہیں ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جس جگہ اعلان نون ہونا چاہیئے وہاں نہیں ہوتا۔ مثلاً

تنہا — کیا اُسنے کیا کسی کا خون :: لالے کی کلی جو سرنگوں ہے

ہوس — خوں کا دعویٰ نہیں قاتل سے بھی محشر میں ہوس :: میں مکر جاؤنگا اُسنے اگر اقرار کیا

" — وہ بعد قتل خوں سے مرے کرکے سرخ ہاتھ :: بولے کہ ہمنے آج سے ترک حنا کیا

غالب — لیکہ دوڑے ہے رگ تاک میں خوں ہو ہو کر :: شہپر رنگ سے ہے بال کشا موج شراب

" — ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا :: کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

شیفتہ — کچھ بیم قتل سے نہیں آنکھوں میں اشک سرخ :: کہتا ہے جوش خوں ترے تیغ و تلوار دیکھکر

شاد عظیم آبادی ــ خوں کی چھینٹیں جو اڑیں حلق بریدہ مرے ؛ شوخ دامن کو عجب ناز سے گردان لیا
غالب کے شعر میں کان اور باقی اشعار میں خون با علان نون ہونا چاہئیے مگر غالباً ضرورت
شعر کی بنا پر کان اور خون نظم ہو گیا ہے جسکے معیوب ہونے میں شبہ نہیں۔
اب ہم متوسطین اور متاخرین کے چند اشعار بطور مثال اور نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔
تنہا ــ گریہ تسکین دہ خاطر ناشاد ہیں سب ؛ پر حقیقت میں ادائیں تری جلاد ہیں سب
غالب ــ بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں ؛ فرمانروائے کشور ہندوستان ہے
" ــ مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان ؛ ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
مولوی اسمٰعیل میرٹھی ــ ہے بے لب و زبان بھی غل تیرے نام کا ؛ محرم نہیں ہے گوش مگر اس پیام کا
ترکیب فارسی کی موجودگی میں مندرجہ چاروں اشعار میں اعلان نون معیوب اور ناجائز ہے۔
شاد لکھنوی ــ یقین ہے کوئی دم دل کہ میرا خوں نہ ٹھہریگا ؛ میں ایسے جوں ہوں اگر ہاتھ بھی باندھوں نہ ٹھہریگا
خواجہ وزیر ــ تیرے رہنے کیلئے جان نے کیا قالب تہی ؛ ہے یہ بینگ سایہ باہر جسم سے اندام روح
حسرت موہانی ــ نہ دل میں خوں نہ آنکھوں میں اشک، جان کے سوا ؛ کوئی اب تپہ کری بھی تو کیا نثار کرے
ان ہر سہ اشعار میں خون اور جان اعلان نون کیساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ جان اور خون کا نا یقیناً معیوب ہے۔

(۱۵) اضافت فارسی بالفاظ اردو

اردو الفاظ کیساتھ فارسی اضافت بھی سراسر معیوب اور ناجائز ہے مگر بعض لوگ
اس سے بھی پرہیز نہیں کرتے مثلاً
میر ــ پھرتی ہے اسکی آنکھیں آنکھوں تلے ہمیشہ ؛ رہتا ہے آب دیدہ پانی تا گلے ہمیشہ
" ــ دشتی سر پھوڑا گئے دلبروں کے گوندھے بالوں کو ؛ کھلا ناکھیلنا مشکل بہت ہے اسیر کا بولوں
کوئی بھی اسطرح سے جی پر اپنے کھیل جاتا ہے ؛ مگر بازیچۂ میر عشق خورد سالوں کو
ان اشعار میں "تا گلو" اور "عشق خورد سالاں" کے بجائے قافیہ کی رعایت سے "تا گلے"
اور "عشق خورد سالوں" کا استعمال کسیطرح صحیح نہیں ہو سکتا۔
شاہ حاتم ــ اتنے چلا ہوں جو مری قسمت میں لکھا ہو ؛ یا پھونکتا ہی یا دم تلوار دیکھنا
ولی ــ دیکھو دستار بختی سانی مرشانی ؛ کھلتی ہیں آج آنکھیں نرگس بیاکی

آبرو ـــ جدھر جاتا ہے تو اے سرد دیکھ ؛ رواں ہو چشم سے دریائے آنسو
سودا ـــ بنگ پی بنگ خیال اسکا ہو افلاک پرست ؛ زاہد اپنیک افیون سے ہو خاک پرست
جرأت ـــ عاشقوں کے دل بلاق یار کے موتی کیطرح ؛ بوسہ کی خواہش میں اس لئے لٹکے ہیں گو
شیفتہ ـــ گل گراں گوش و چمن صورت حیرانی ہے ؛ کس گلستاں میں ہمیں حکم غزلخوانی ہے
اس شعر میں اضافت نہیں ہے البتہ ایک فارسی اور دوسرے اردو جملے کو درمیان
واو عطف موجود ہے ۔ یہ بھی معیوب اور متروک ہے ۔
خلیق ـــ طنبور کا ندرہے دریا میں دھار پڑتی ہے ؛ امنگ دل کی چمن میں پکار پڑتی ہے
اسیر ـــ ملازم ہیں جو دنیا میں تو ہم سرکار ساقی کے ؛ بسبو تنخواہ میں چھٹی میں ہمکو جام ملتا ہے
سرکار کا لفظ اس معنی میں اردو ہے اسلئے اسکی اضافت ساقی کیساتھ جائز نہیں ہے ۔
رنگین ـــ پریوں کے ہیں لباس بسنتی کی کیا بہار ؛ آرائش بسنت کی ہے حسن باغ میں
غالب ـــ پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ؛ گرم بازار فوجداری ہے
عدالت کچہری کے معنی ہیں اور فوجداری مقابل دیوانی اردو الفاظ ہیں اسلئے
اصولاً درِ عدالت یا بازارِ فوجداری لکھنا جائز نہیں ہو سکتا اگرچہ عملاً اسکا کوئی لحاظ
نہیں کرتا نہ کرنا چاہیئے ۔
غالب ـــ غلطہائے مضامین مت پوچھ ؛ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
بقول مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی لفظ غلط میں یائے مصدری لگانا غلط
در غلط ہے ۔ فارسی میں کسی نے ایسا تصرف نہیں کیا بلکہ قدیم اردو میں بھی نہیں
بڑھائی گئی مثلاً
میر ـــ غلط اپنا کہ اس جفا جو کو ؛ سادگی سے ہم آشنا سمجھے
ہاں اب محاورہ ہندیوں کا یہی ہے کہ غلط کو غلطی کہتے ہیں ۔ غلطی کا لفظ ہندی ہے ۔
فارسی ترکیب میں اسکو لانا اور فارسی کی جمع بنانا اور فارسی اضافت اسکو دینا صحیح نہیں ۔
اشرف ـــ کہے ہیں شعر سخن فہم کے لئے اشرف ؛ ہو دگر نہ مرثیہ واہ واہ سے کیا کام
حفیظ جونپوری ـــ روتا ہے وہ حسین جو مرثی بزم سوگ میں ؛ کچھ لو نہیں مرثیہ پہلی ہنسی بوفائی ہے

(۱۶) ضلع جگت کی بے لطفی

لکھنؤ کی شاعری کے دورِ آخر میں ضلع جگت کی بڑی قدر تھی اور لفظی رعایات کے بغیر تو کوئی شعر قابل تعریف سمجھا ہی نہ جاتا تھا مثلاً امانت اور نسیم صاحب مثنوی کا کلام رعایت لفظی کا خزینہ اور ضلع جگت کا گنجینہ ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ اس رنگ سخن کی بے لطفی لوگوں کو معلوم ہوتی گئی یہانتک کہ آج لکھنؤ میں بھی اس طرز تصنع کے قدر داں بہت کم ملینگے۔ بہرحال ضلع جگت کا آجکل منجملہ عیوب سمجھا جانا مسلم ہے ذیل میں ہم اسکی چند مثالیں درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

شاہ مبارک آبرو ؎ اُن لبان کو یقین مصری جان ؛ راست کہتا ہوں ہمیں مت شک کر

شک کر یا شکر، مصری کی رعایت سے لائے ہیں۔

امانت ؎ کیا ہے تازہ نخلِ غم کو آہیں سرد بھر بھر کر ؛ بڑی محنت سے میں نے یہ شجر جاڑے میں پالا ہے

اسیر ؎ تم گنجفے کو پھینک کے صاحب جو اٹھ چلو ؛ دامن پکڑ لے دوڑ کے یکّہ غلام کا

" ؎ کثرت غم سے جو جاڑے میں نکل آئے اسیر ؛ چاہیے وردِ زباں حضرت باری ہوجائے

شاہ نصیر ؎ توڑ دل کا نہ مار کے پتھر شیشہ ؛ سنگدل ہمنے بنایا ہے یہ مرمر شیشہ

رشک ؎ اکثر تری تلاش نے دوڑایا دھوپ میں ؛ اس دوڑ دھوپ کا مجھے لپکا لگا رہا

" ؎ گردون کے گنجفے میں اراذل کی جیت ہے ؛ سرتاج آفتاب ہے اکا غلام کا

خواجہ وزیر ؎ تم جو پتھراؤ کرو کور بھی بینا ہوجائے ؛ منہ پہ پتھر جو لگے آنکھ کا ڈھیلا ہوجائے

مہر لکھنوی ؎ مجھکو ساقی نے دیا پیپا برانڈی کا اگر ؛ ایکدم میں سب کا سب پی پاکے خالی کردیا

نادر ؎ کانٹا مجھے اے گل تری فرقت نے کیا ہے ؛ تولا تو برابر سے ماشا نہیں اٹھتا

" ؎ فرض عینی آنکھوں کی الفت ہے خاص عام پر ؛ کون ہے وہ جو نہیں پتلا ہے اس بادام پر

" ؎ بندھا آتا ہوں دم صبح در دولت میں ؛ قفل کھل جائے جو طالع کی رسائی ہوجائے

طالع کی آواز تالے کی سی ہے اسلئے اسکو قفل کی رعایت سے لائے ہیں۔ استغفر اللہ

عرش لکھنوی ؎ کیا دیا بوسہ لب شیریں کا ہو کر ترش رو ؛ منہ ہوا میٹھا تو کیا، دل اپنا کھٹا ہوگیا

" ؎ آنکھیں سفید ہوگئیں کاغذ کی طرح صاف ؛ کس سادہ رو کو خط مجھے لکھنے کا تاؤ ہے

تاؤ ہے یعنی جلد خطا لکھنے کی دل سے لگی ہے۔ کاغذ کے ورق کو بھی عوام تاؤ کہتے ہیں محض اسلئے غرض کی ساری قابلیت کاغذ کی رعایت سے تاؤ کا لفظ لانے میں صرف ہوئی ہے۔

(۱۷) شتر گربہ

بقول حضرت شوق نیموی "ایک ہی چیز کو تعظیم اور تحقیر دونوں کے ساتھ استعمال کرنا شتر گربہ ہے۔ اسکو شتر گربہ اسلئے کہتے ہیں کہ اونٹ اور بلی میں جو مناسبت ہے وہی صیغہ جمع و مفرد اور کلمات تعظیم و تحقیر میں بھی ہے جیسے ؎

تیری باتوں کا کیا ٹھکانا ہے — آپ کا تو کی اک زمانا ہے

یاس پاس جب سے ہمارا یار نہیں — دل کو اک دم مرے قرار نہیں

یہاں پہلے شعر کے پہلے مصرع میں "تیری" کا کلمہ تحقیر اور دوسرے میں "آپ کا" کلمہ تعظیم کا اجتماع شتر گربہ ہے اور معیوب ہے۔ علی ہذا القیاس دوسرے شعر میں ہم صیغہ جمع ہے اور مرے صیغہ واحد یہ بھی شتر گربہ ہے اور معیوب۔ متقدمین و متوسطین میں سے اکثر اور متاخرین اور معاصرین میں سے بھی بعض شعرا نے اس باب میں کافی احتیاط سے کام نہیں لیا ہے اور جا بجا انکے کلام میں یہ عیب نمودار ہوا کرتا ہے مثلاً

میر سوز ؎ تیرے در سے اب ہم سفر کر چلے ٭ جیو تم کہ اب ہم گزر کر چلے

میر حسن ؎ غم ہوا تھا مرے نالوں کا تمہیں کس کس دن ٭ منھ مرا آپ نہ کھلوائیے اور سو رہیے

جرأت ؎ مت یہ گھبرا کر کہو اب یاں سے بندہ جائیگا ٭ کوئی مر جائیگا صاحب آپ کا کیا جائیگا

علیشی ؎ نہ کر نالذت شمشیر ابرو عام اے قاتل ٭ یہ علیشی ہی تمہارا لائق تیغ آزمائی ہے

واضح ہو کہ جب محبوب کو قاتل ظالم ستمگر یا جیلہ جو وغیرہ الفاظ کیساتھ خطاب کرنا ہوتا ہے تو اسکے لئے حرف خطاب آپ یا تم نہیں بلکہ تو استعمال کرتے ہیں۔ مگر علیشی کے شعر میں ایسا نہیں ہے بلکہ "اے قاتل" کے ساتھ "تمہارا" استعمال کیا گیا ہے اور یہی معیوب ہے۔

شہیدی ؎ رنجش کا مری پاس نہیں آپکو مطلق ٭ پر ہم تجھے ہم دیکھ کے ڈھ جاتے ہیں کیسے

اس شعر میں ڈبل عیب ہے اسلئے کہ مری کیساتھ تم اور آپکو کیساتھ تجھے استعمال
کیا گیا ہے۔

انشا — عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے کبھی بات کی جو سیدھی تو اُلٹا جواب ۔ اُلٹا
ہے — آج تو کپڑے نہ بدلو تم کو میری ہی قسم ؛ آپ کا میلا کچیلا پن بھی کچھ بیداد ہے
میر ممنون — برا ماننے ست مرے دیکھنے سے ؛ تمہیں حق نے ایسا بنایا تو دیکھا
ہے — خوبی یہ ناز اپنی جو کہئے بجا ہے ؛ کچھ اُڑا دنے تمکو اک چاند سا دیا ہے
کیجئے کیساتھ آپ کو ہونا چاہیئے تھا۔ تمکو کیساتھ کہیئے کا اجتماع مستر گربہ ہے۔

شاہ نصیر — آپ تو زہر میں شکر کا مزہ چاہتے ہو ؛ گالیاں دیتے ہو اور ہمسے دعا چاہتے ہو
آپ کے کیساتھ چاہتے ہو نہیں بلکہ چاہتے ہیں ہونا چاہیئے تھا۔

غالب — وعدہ آنیکا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے ؛ تم نے کیوں سونپی ہے اپنے در کی دربانی مجھے
تمہارا — ہمسے کرتے ہو بیان غیر دل کی یاری آنکر ؛ رہ گئی ہے آپکی یہ دستداری آنکر
آتش — فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب ؛ بس ہو چکی نماز مصلے اٹھائیے
اسیر — شعر جو کہتے ہو وہ عشق میں ڈوبا ہی اسیر ؛ آجکل آپ کا انداز بیان اور ہوا
ہے — کیا دیکھتے ہو ہاں سے بازار کو دیکھو ؛ بے پردہ نہ کیجئے کوئی سرکار کو دیکھو
سرکار کلمہ تعظیم ہے اسکے ساتھ دیکھتے ہو اور دیکھو کے بجائے دیکھتے ہیں اور دیکھئے
ہونا چاہیئے تھا۔

اسیر — شاہ آپکی طرف ہے وزیر آپکی طرف ؛ پرچہ تمہارے ظلم کا کیونکر لگائیے
ہے — آئینہ ہاتھ میں ہے سمجھ کر دو غرور ؛ تمسا بھی دوسرا ہے کوئی خوب دیکھئے
دیکھئے کلمہ تعظیم ہے اسکو تم یا کر دو کیساتھ استعمال نہ کرنا چاہیئے تھا۔

اسیر — بھیجیں ہیں آپکو تم نے سنی حضرت دل بات مری ؛ بندگی آپکو اے قبلۂ حاجات مری
ہے — ضرور کیا ہے تمہیں روزہ اس نزاکت پر ؛ کہ جی حضور کا وقت نماز ڈوب گیا
سحر لکھنوی — اب وہ تم ہو نہ وہ ہم ہیں نہ وہ دل نہ وہ آنکھ ؛ آپ بھی چوک گئے ہم نے بھی دھوکا
ہے — اب کھلے ستم اے ستم ایجاد کریں آپ ؛ افلاک کے پرچے میں نہ بیداد کریں آپ

اسے ستم ایجاد کلمہ تعریض و شکایت ہے اسکے ساتھ "کرین آپ" کی جگہ "کرے تو" ہونا چاہیئے تھا

سحر لکھنوی ــ جو کچھ ہو تم ہو کچھ بھی نہیں لے حضور ہم :: ہر شے میں دیکھتے ہیں تمہارا ظہور ہم

عرش لکھنوی ــ وہ وفادار تھے مجرم جو ہمارا سمجھو :: نہ رہی طینت قاتل میں جفا میرے بعد

" ــ اچھا مجھے بھی کچھ نہیں پروا حضور کی :: تمکو نہیں جو عاشق غمخوار سے غرض

مجروح دہلوی ــ کہتے ہو خبر جائے تو آؤں :: خوب رکھی ہے آپ نے یہ آڑ

عاشق دہلوی ــ نہ جرعہ جرعہ دیکر میکشوں کو اتنا ترساؤ :: خدا کیواسطے چھوڑو بھی ساقی کم نگاہی کو

محبوب کے مانند ساقی کو بھی آپ اور تم کے بجائے تو سے خطاب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے "ساقی کم نگاہی کو چھوڑ" ہونا چاہیئے تھا چھوڑو کا اجتماع ساقی کیساتھ شتر گربہ ہے

آباد لکھنوی ــ نقد دل نذر لایا تھا نہ کیوں تم نے لیا :: وجہ کیا آپ کو آباد سے انکار کی تھی

اشرف کسمنڈوی ــ بزم اغیار میں چلو اشرف سخنور جمع ہیں :: آپکو منظور ہو گر لطف صحبت دیکھنا

چلو کیساتھ تمکو یا آپکو کیساتھ چلئے ہونا چاہیئے تھا۔

اشرف ــ کیوں بار بار دیکھتے ہو تم ادھر بہت :: الفت سے ہو حضور تو ہے اک نظر بہت

مائل دہلوی ــ حرم میں بیٹھے ہو مائل خدا خدا کیجئے :: یہاں وہ ساقی مہوش کہاں شراب کہاں

"بیٹھے ہو" کیساتھ "خدا خدا کرو" ہونا چاہیئے تھا۔

بیخود دہلوی ــ کبھی دیکھا بھی ہے کعبے میں خدا کو زاہد :: دون کی آپ تو ہر وقت لیا کرتے ہیں

شعرا ساقی کی طرح زاہد سے بھی "آپ" کے بجائے "تو" کرکے بات کیا کرتے ہیں۔ اور یہی اچھا بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بیخود کے شعر میں اسکے بالکل خلاف ہے اور اسی کو شتر گربہ کہتے ہیں۔

بیخود دہلوی ــ کسی کی ہے اک کافر بدکیش کی دعوت ہمیں :: دو گھڑی کیلئے زاہد ہمیں جنت دیدو

"دیدو" یعنی تم دیدو ــ حضرت زاہد کو آپ یا تم سے خطاب کرسکتے ہیں لیکن صرف زاہد کو تو کے سوا نہ آپ کہہ سکتے ہیں نہ تم ــ علی ہذالقیاس ــ "دو گھڑی کیلئے زاہد ہمیں جنت دیدے" ہونا چاہئے تھا۔ یہاں نہ دیجئے صحیح ہے نہ دیدو

داغ دہلوی ؎ ادھر آ کہ اس بات پر بوسہ لیلوں :: مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے

"جھوٹی قسم کھانے والے ادھر آ" ہونا چاہیے "ادھر آ کہ" لکھنا معیوب اور تنفر گر ہے۔

داغ دہلوی ؎ غم فراق میں ہو داغ اسقدر بیتاب :: ذرا سے رنج میں جان آپکی نکل جاتی

"اسقدر بیتاب ہے" یعنی تم بیتاب ہو۔ اس محذوف تم کے ساتھ آپ کا اجتماع تنفر گر ہے۔ بعض محققین نے بال کی کھال نکالکر یہ ثابت کرنا چاہا کہ "(۱) تو اور تم اور آپ اور تم کا اجتماع ایک شعر میں نادرست نہیں ہے" اور اسکی توجیہ اسطور پر کی ہے کہ مخاطب کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں (۱) ادنیٰ اسکے لئے تو موضوع ہے (۲) اوسط اسکے لئے تم موضوع ہے اور (۳) اعلیٰ اسکے لئے آپ موضوع ہے۔ چونکہ تم توسط کے درجے میں ہے اس سبب سے اسکو تو اور آپ دونوں کیساتھ فی الجملہ مناسبت ہے۔ راقم حروف کے استاد مرحوم منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا بھی یہی مسلک تھا۔ چنانچہ راقم نے اپنے زمانۂ طالبعلمی میں علیگڈھ کالج سے ایک غزل رامپور بغرض اصلاح روانہ کی تھی جسکا مطلع یہ تھا ؎

ملتے ہیں اسطرح سے کہ گویا خفا نہیں :: کیا آپکی نگاہ سے ہم آشنا نہیں

منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرع بدلکر یوں کر دیا ع

ملتے ہو اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں

لیکن دوسرا مصرع بدستور رہنے دیا۔ گویا آپکے نزدیک تم کیساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

مگر راقم کے خیال میں تم اور آپ یا تو اور تم کا اجتماع بھی قابل اعتراض اور لائق احتراز ہے۔

(۱۸) الفاظ مخصوص بہ مردان و زنان

مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی اس باب میں اپنی شرح دیوان غالب کے صفحہ ۱۱۷ میں لکھتے ہیں کہ "فارسی و اردو میں غزل کے اصول جو قائم ہوئے ہیں بموجب انکے مرد ہی عاشق اور مرد ہی معشوق ہونا چاہیے اور معشوق کی نسبت مؤنث کے صیغوں کا استعمال کرنا بھی نہیں درست

بلکہ دو پیری آیا اور وہ جو آیا بے تکلف سے نظم کرتے ہیں میر نے تو اس باب میں
ایسی افراط کی ہے کہ جا بجا اُن کے دیوان میں دہلی کے لونڈے بھرے ہوئے ہیں لکھنؤ
شعرا جو کہ انھیں کے فیضیاب تھے انھوں نے بھی اس قاعدہ کو مسلم سمجھا لیکن
کسی قدر اصلاح کی یعنی چوٹی اور افشاں اور مسی اور کاجل اور محرم اور کرتی
اور دوپٹہ اور آنچل وغیرہ کے مضمون کہنا شروع کیے لیکن صیغے مذکر ہی کے
استعمال کیے مگر جن لوگوں میں فارسی یا اردو کے شعرائے قدما کا مذاق پیدا ہو گیا ہے
وہ چوٹی اور آنچل وغیرہ جو جو لفظ کہ عورتوں کیساتھ مخصوص ہیں اُنکے استعمال
کو اب بھی مکروہ سمجھتے ہیں اور پھر میر صاحب نے جیسی افراط کی ہے اسکو بھی
پسند نہیں کرتے وہ چاہتے ہیں معشوق مبہم رہے اور بیشک یہ اچھا طریقہ ہے"
ہماری رائے میں بھی ابہام ہی صحیح اور مناسب ہے اسلئے کہ بصورت دیگر اردو شاعری
میں پاکیزگی خیال نکات تصوف اور بیان عشق حقیقی کی گنجائش باقی نہ رہ سکیگی۔ مثلاً

میر ؎ خط میں ہے کیا سماں پسینے پر ۔۔ موتی گویا جڑے ہیں مینے پر
" ؎ میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جسکے سبب ۔۔ اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں
" ؎ افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے ۔۔ قصہ ہمارا اسکا یاروں شنیدنی ہے
زکی مرادآبادی ؎ کرتی جالی کی تری دیکھ کے اے رشک قمر ۔۔ شکل انجم ہے مری دیدہ دری کا عالم
اسیر ؎ وہ ہے کیوں نہ چھپیں خط عذار پہ نکلا ۔۔ اسیر شب کو نکلتا ہے آفتاب کہیں
جگر ؎ خط نمودار ہوا وصل کی راتیں آئیں ۔۔ جسکا اندیشہ تھا منہ پر وہی باتیں آئیں
عرش لکھنوی ؎ لپکا رہتا ہے خیال اک کودک قوال کا ۔۔ بیقراری میں ہے عالم صوفیوں کے حال کا
ناسخ ؎ دانے ہیں انگیا کی چڑیا کے بنت کی چنریاں ۔۔ ملتی ہے پانی کی مچھلی موتیوں کی آب میں
بحر ؎ خوشی کسکو نہیں صاحب تمھیں مستی مبارک ہو ۔۔ جو نیچے تو پریوں میں طبق حوروں میں جھنکا ہو
خواجہ وزیر ؎ خواب میں دست تصور بھی کبھی محرم نہیں ۔۔ اے پری عنقا سی کچھ انگیا کی چڑیا کم نہیں
نادر ؎ وہ دم رقص جو گھنگرو کو بجاتے آئے ۔۔ خواب سے فتنۂ محشر کو جگاتے آئے

قصہ مختصر یہ کہ شعر میں الفاظ مخصوص بہ زنان و مردان کا لانا یقیناً معیوب اور قابل

رک ہے اور پیروان مذاق صحیح اس عیب سے اپنے کلام کو ہر حال میں محفوظ رکھتے ہیں۔

(۱۹) توالیٔ اضافات

اردو زبان میں بعض اوقات ترکیب فارسی کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ خصوصاً نظم میں جہاں جگہ کم اور مضمون زیادہ ہو لیکن ہر حال میں اسکا لحاظ رکھنا لازم ہے کہ اضافتوں کی کثرت ناگوری کی حد تک نہ پہنچنے پائے محققین کا یہ قول کہ تین اضافتوں تک جائز اس سے زیادہ ناجائز کوئی مسلمہ اصول نہیں لیکن ایک حد تک قابل قبول ضرور ہے۔ مثلاً

عیشی ؎ میں سرگرم بیانِ سوزشِ داغِ محبت ہوں ؛ خدا کرتا ہے شعلہ بھی مری آتش بیانی سے

خواجہ وزیر ؎ تم ادھر خود دیکھتے ہو اور ادھر میں ناتوان ؛ ہوں نگاہِ دیدۂ تصویرِ پشتِ آئینہ

غالب ؎ کمالِ گرمیٔ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ ؛ برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

سالک دہلوی ؎ دستِ آبادیٔ دلِ مشتاقِ وصلِ یار کو ؛ آرزو کا اک جہاں امید کی دنیا کہوں

غالب ؎ لبِ لوِ قانگاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی ؛ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

آسی سکندرپوری ؎ زاہد و واعظ جو آتے سب تکلف برطرف ؛ خوب فرشِ بوریا نقشِ موجِ بادہ کر

(۲۰) استعمال صفت بجائے موصوف بغیر حرف اشارہ

خصوصاً الفاظ متعلق بہ محبوب

دلربا، شوخ، گلرو، جانان، بیمہر، ماہ، دلستان، رشکِ قمر، بت، غیرتِ لیلا، پردہ نشین، شعلہ رو، کافر، تغافل شعار، رشکِ حور وغیرہ اکثر الفاظ محبوب کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں مگر یہ امر بھی مسلم ہے کہ انکا استعمال بغیر حرف اشارہ وہ یا اس کے جائز نہیں سمجھا جاتا۔ افسوس کہ متقدمین و متوسطین سے لیکر متاخرین و معاصرین تک بہت کم ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اس باب میں کافی احتیاط سے کام لیا ہو۔ ملاحظہ فرمائیے:-

ولی ؎ سحر پرداز ہیں پیا کے نین ؛ ہوش دشمن ہیں خوش ادا کے نین

ہوش دشمن یعنی دشمن ہوش ؛ "خوش ادا کے نین" یعنی اس خوش ادا کی آنکھیں یہاں

"وحشِ اداکے نین" بغیر اس کے صحیح نہیں۔

میر — میلانِ دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر ÷ دیتا ہے جان عالم اُسکی جفا کے اوپر
"میلانِ دلربا" یعنی "میلان آن دلربا" یا "اُس دلربا کا میلان" دلربا بغیر
اس کے صحیح نہیں ہے۔

سوز — حالِ آوارگی شوخ کہوں کیا یارو ÷ شام پھر آئے جو نکلے وہ سحر سے باہر
"آوارگی آن شوخ" یا اُس شوخ کی آوارگی ہونا چاہئے تھا۔

غالب — خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

اختر شاہ اودھ — ترے نصیب کی گردش حقیر کرتی ہے ÷ جو مہ کے ہاتھ سے اختر حقارتیں پائیں
رسکا کیا ہے اختر بے پر کو مہ نے مکر سے قید ÷ کہیں بھی ہوتا ہے ایسا شکار کا اسلوب
صرف "مہ" کی جگہ "اُس ماہ" ہونا چاہیئے "اُس مہ" بھی کافی ہوگا۔

ذکی مرادآبادی — شب خلاط طرفہ ہم دلستاں میں تھا ÷ دل سے تپاک حرف شکایت زباں پہ تھا

ناسخ — ایک دم پاتا نہیں چین اپنے گھر میں آئینہ ÷ محو ہے نظارۂ رشکِ قمر میں آئینہ
"نظارۂ رشکِ قمر" یعنی "نظارۂ آن رشکِ قمر" یا "اُس رشکِ قمر کا نظارہ"

رشک لکھنوی — بے وجہ نہیں گیسو و ابرو کے اشارے ÷ یہ سب ہیں بتِ غیرت آہو کے اشارے

ہجر لکھنوی — شہرہ بلند ہے بتِ صاحب جمال کا ÷ غیرت سے منہ سفید ہے ماہ کمال کا

خواجہ وزیر — یوں نہیں ہم ساربانی غیرتِ لیلیٰ نہیں کرتے ÷ نہیں محمل تو مضموں باندھتے ہستی ہی محمل کا
"غیرتِ لیلیٰ" یعنی "اے غیرتِ لیلیٰ" حرف اشارہ کی طرح حرف ندا کا حذف بھی اکثر
موقعوں پر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس سے بھی بچنا چاہیئے۔

وحشت — ظالم کی تو عادت ہے ستاتا ہی رہیگا ÷ اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہیگی

مومن — چارہ گر اور بھی اچھا وہ کریگا ٹکڑے ÷ پردۂ شوخ جو پیوند گریباں ہوگا

غالب — شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے ÷ یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے
"بے مہر" کے بجائے "وہ بے مہر" ہونا چاہیئے تھا۔

ناظم – جان دی مفت غم پردہ نشین میں ناظم ؛ ہائے نادان کہاں جی کو لگایا تونے
زکی دہلوی – جھوٹ جاب یکھو بت نشتر مگین کو میں ؛ یارب ترس گیا نگہ دلنشین کو میں
میر حسین – مر گیا ہوں شعلہ رو پر جا ہو دوزخ مجھے ؛ خلد کو کب ہے تحمل اس تن محرور کا
"ظالم کی" یعنی "اس ظالم کی" "غم پردہ نشین میں" یعنی "اس پردہ نشین کے غم میں"
"بت نشتر مگین" کو یعنی "اس بت نشتر مگین" کو۔ "شعلہ رو پر" یعنی "اس شعلہ رو پر"
عبداللہ خان مہر – گر زلف کو لہرائے نہانے میں مجھے شوخ ؛ ہر موج دریا پہ ہو زنجیر کا دھوکا۔
"شوخ" یعنی "اُس شوخ" مرزا نسیم نے پہلا مصرعہ بدل کر یوں کر دیا تھا :-

"زلفوں کی تری لہر نہانے میں گر آ کرے"

طاہر فرخ آبادی – اے باغبان یہ سرو صنوبر ہے کیا بلند ؛ طوبیٰ سے ہاتھ بھر ہے قد دلربا بلند
"قد دلربا" کے بجائے "قد آن دلربا" یا "آن قد دلربا" ہونا چاہیئے تھا۔
اسمٰعیل میرٹھی – غیروں سے ملتفت بت خود کام ہو گیا ؛ اور اپنے حق میں طعن تغافل غضب ہوا
لطافت – بے پردہ ہوا باتوں میں اغیار سے ایسا ؛ کیا تھر ہے چلمن کو کبھی جانان نے نہ چھوڑا
نظم طباطبائی – ترک الفت کر کے ٹھہرا دل بھی کافر کار نگ ؛ دل کو حیرت ہے کہ پہلی تو یہ عیاری نہ تھی
بیخود دہلوی – ہوگی نہ شام وعدہ کی خود سر کو اطلاع ؛ کی بھی ہماری مقدر کو اطلاع
(۱) "بت خود کام" یعنی "وہ بت خود کام" (۲) "جانان" یعنی "اُس جان جان" (۳) "کافر کا رنگ" یعنی "اُس کافر کا رنگ" (۴) "خود سر کو اطلاع" یعنی "اُس خود سر کو اطلاع"
داغ – ہے تاک میں وہ دیدہ نظر دیکھئے کیا ہو ؛ پھر دیکھ لیا اُس نے ادھر دیکھئے کیا ہو
" – دو بار تو نے ذکر کیا رشک حور کا ؛ ناصح خدا کرے تجھے دو نا ثواب ہو
" – تاک میں دل کے ہے نشیلی آنکھ ؛ اور کہتے ہیں ہوشیار کہے
(۱) "وہ دیدہ نظر" کے بجائے "وہ دیدہ نظر" (۲) "رشک حور" کے بجائے "اُس رشک حور کا" (۳) صرف "نشیلی آنکھ" کے بجائے "وہ نشیلی آنکھ" ہونا چاہیئے تھا۔
جلیل – وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو ؛ اب کیا جواب دوں نگہ انتظار کو

جلیل ؎ نگاہِ ناز یہ کہتی ہے تیر افگن کی :: کہ میں ہوں ڈھکے لیے تیر ہے گلو کیلئے
"تغافل شعار کو" یعنی "اس تغافل شعار کو" "تیر افگن کی نگاہ" یعنی "اس تیر افگن کی نگاہ"
جگر مراد آبادی ؎ ملتی نہیں ہے لذت درد جگر مجھے :: بھولی ہوئی ہو نگہ فتنہ گر مجھے
"بھولی ہوئی ہو نگہ فتنہ گر مجھے" یعنی "وہ نگاہ فتنہ گر مجھے بھولی ہوئی ہو"

(۲۱) "و" عطف کے بجائے "اور" یا "اور" کے بجائے واو عطف کا استعمال

بقول مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی ترکیب بہ عطف میں اس طرح کی غلطیوں سے بچنا چاہیئے جیسے۔ ع۔ سزا وار خلافت اور امامت ایسے ہوتے ہیں۔ یا جیسے

ع دل مدعی و دیدہ بینا مدعا علیہ

فارسی کا واو اردو میں جبھی استعمال کرتے ہیں جب مفرد کا مفرد پر عطف ہو اور دونوں فارسی لفظ ہوں جیسے "دل و دیدہ" نہیں تو واو عطف فارسی کا لانا بیجا ہے مثلاً "دل و آنکھ" کہنا صحیح نہوگا۔ اسی طرح "آنکھ پڑتی ہے و دل آتا ہے" ان دونوں جملوں میں واو سے عطف کرنا درست نہیں۔ بالفاظ دیگر دو ہندی جملوں کے درمیان فارسی کا عطف لانے سے احتراز لازم ہے مگر بعض شعرا نہیں کرتے۔ مثلاً

ولی ؎ شغل بہتر ہے عشقبازی کا :: کیا حقیقی و کیا مجازی کا
میر ؎ یہ جور و جور کش تجھے کہاں آگے عشق میں :: تجھ سے جفا و میر سے رسم وفا چلی
" ؎ بوسہ لبوں کا مانگتے ہی ہم بگڑ گئے :: بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص و پیار میں
" ؎ جوں ابر یکسانہ روتے اٹھے ہیں کھر سے :: برسے ہے عشق اپنی دیوار سے و در سے
سودا ؎ سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش :: دھڑکے ہے پڑا دل کہ ہو مشتعل آتش
" ؎ تجھ نگاہ گرم کی حسرت سے دل مارے ہے جوش :: راتکو دیکھوں ہوں میں جب شمع و پروانے میں دھوم

پروانہ لفظ فارسی ہے مگر پروانے، میں ے کے ساتھ اردو ہو گیا۔ اس حالت میں "شمع و پروانے میں" لکھنا صحیح نہیں ہے۔ "شمع اور پروانے میں" ہونا چاہیئے تھا۔
میر ؎ اپنے کوچے میں فغاں جسکی سنو ہو دن رات :: وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

ملک الشعرا اختر ۔ تو نہ یاد رہا سے کچھ کہ محالات سے ہے ٭ چشم عاشق سے رہے خون جگر جاری و آب

مومن ۔ آپ مجھسے بنا ہینگے یہ سچ ہے ٭ یاد فاحش و بیہودہ ہے عشق

" ۔ بے دعا درد بیہودہ ہے وہ شوخ ٭ بے اثر آہ و بیقرار ہے دل

میر ممنون ۔ بیعت پذیر سلسلۂ پیچ و تاب ہیں ٭ شانے سے موے مو سے بلا و بلا سے ہم

غالب ۔ ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں ٭ معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

انور ۔ مذاق مدعی ہے تلخ و کلام دوست ہے شیرین ٭ سخن میں بھر دیا انور نے زہر و انگبین کیا کیا

بحر لکھنوی ۔ نشہ سر جوش جوانی کا ہے ابتک مجھکو ٭ نہ سمونگا میں کلام و نہ پیام واعظ

عاشق دہلوی ۔ اب ہمارا آپکا ہے تذکرہ ٭ ذکر مجنون اور لیلی ہو گیا

مجروح دہلوی ۔ اس سے نبھنے کے کچھ نہیں اسباب ٭ وہ تغافل شعار و ہمین بیتاب

منشی منیر ۔ میرا سمند عمر و سمند بہار ہو ٭ جوڑی یہی حضور کی بگھی کو راس ہے

داغ ۔ ہاتھ کیون رکھتے ہو منہ پر مرے مطلب کیا ہے ٭ باعث رنجش و تکرار کہون یا نہ کہون

تکرار لفظ ہندی ہے اسکے اور رنجش کے درمیان " و " عطف صحیح نہیں ہو سکتا۔

محشر لکھنوی ۔ مارے ہنسی کے لوٹ گیا شعر حال ٭ موسی کا شوق و طاقت دیدار دیکھکر

حسرت موہانی ۔ حشر و بشارۂ ثواب کا یار ٭ مین کہان اور یہ عذاب کہان

(۲۲) ابہام و اشکال مضمون

مضمون شعر کا مبہم یا مشکل ہونا بھی معائب سخن میں داخل ہے جسکی مثالین غالب اور مومن یا تلامذہ و متبعین غالب کے کلام میں اکثر ملتی ہیں۔ مثلاً

غالب ۔ میکدہ گر چشم مست ناز سے پائے شکست ٭ موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

" ۔ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ٭ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

" ۔ قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ ٭ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

مومن ۔ بچاؤن آبلہ پائی کو کیونکر خار ماہی سے ٭ کہ ام عرش سے پھیلا ہے یا سبطانون تلا

" ۔ دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے ٭ فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

ان اشعار کو ہم بے معنی نہیں کہتے لیکن انکا مطلب بیان کرنا کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں

(۲۳) غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال

اشعار اور خصوصاً غزل کے اشعار میں غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال بدرجۂ غایت ناگوار سمجھا جاتا ہے۔ یہ عیب زیادہ تر ان خشک شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے جنکی شاعری کو سوز و گداز سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے مثلاً

ناسخ ؎ عارفوں کو ہے در و دیوار ادب آموز ہے :: مائل گردن کشی ہے انحنا محراب کا

یہاں انحنائے محراب یعنی محراب کا منحنی یا کج ہونا معناً بالکل صحیح ہے مگر لفظ انحنا غیر شاعرانہ ہے اسلئے اچھا نہیں معلوم ہوتا

رشک لکھنوی ؎ فرق یار پہ پڑے میرے دھڑ کا بوجھ :: جب ہو چکا تھا سر یہ دھڑ کا لگا رہا

بحر لکھنوی ؎ سفینہ نوح کا اللہ نے تجھکو بنایا ہے :: یونہیں بیڑا کریگا پار سب فساق و فجار کا

عرش لکھنوی ؎ ہم جو مکاں میں ترے آئینگے یار :: غیر ہیں کیا انکے پدر جائینگے

یعنی ہمارے آنے پر غیر تو کیا ہے غیر کے باپ کو نکلنا پڑیگا۔ پدر کا لفظ اور یہ پورا مضمون حد درجہ غیر شاعرانہ اور عرش کی بد مذاقی پر دلالت کرتا ہے۔

الیشا ؎ جلال و عظمت داور خالق ملکوت :: خیال کرکے یہ کہتا ہوں کھلے ہے پر دوست

اختر شاہ اودھ ؎ حلقۂ چشم کو پابوسی کی حسرت ہے بہت :: آنکھ میں کھچ جائے پاپوش سما و صبا

بیخود دہلوی ؎ حشر تک کیوں بات جاتی کیوں پڑے غیروں کے منہ :: گھر میں سمجھوتا ہمارا آپکا ہو جائیگا

ولہ ؎ آنکھ سے ہے وصل کا اقرار دل و گلدا ہی ہے :: تم زباں سے اپنی کہہ دوگے تو کیا ہو جائیگا

یہاں بیخود کے پہلے شعر میں سمجھوتا اور دوسرے میں گلدا دونوں غیر شاعرانہ الفاظ ہیں اور اسی وجہ سے انکا استعمال یقیناً معیوب ہے۔

بیخود دہلوی ؎ نہ دبا غیر سے باتوں میں بڑی بات رہی :: گو وہ نازک ہی مگر دل کا کڑا نکلا

عارف ہسوی ؎ عطا کر لذت درد جگر پھر اک دفعہ یارب :: دل ناشاد کو پھر سے کہیں پھر مبتلا کر دے

"اک دفعہ" غیر شاعرانہ لفظ ہے اسکے بجائے ایکبار ہونا چاہئیے تھا مثلاً

عطا اک بار پھر ہو لذت درد جگر یارب
دل ناشاد کو پھر سے کہیں پھر مبتلا کر دے

(۲۴) سقوط حروف مثل "ع" "ک" "و" "ح" وغیرہ

اشعار میں ع۔ ک۔ و۔ ح۔ وغیرہ حروف کا سقوط بھی معیوب و ناقابل احتراز ہے مثلاً

میر — عالم حسن ہے عجب عالم ،، چاہیئے عشق بھی اس عالم سے

دوسرے مصرعے میں "اس عالم" پڑھنے میں "اسالم" ہو جاتا ہے گویا ع درمیان سے ساقط ہو جاتا ہے اور یہ کسیطرح جائز نہیں ہو سکتا۔

شاہ نصیر — چہرے کا رنگ کسطرح بدلے کہ موج اشک ،، زنجیر ہو رہی ہے بپائے شکست رنگ
عاشق دہلوی — بعد مدت کے آج بادہ کشو ،، تھوڑی سی تلچھٹ ہاتھ آئی ہے
حالی — باد صبا کی پھونک کیا جانے کان میں کیا ،، پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں
حفیظ جونپوری — لے گئے دنیا سے لوگ علم و عمل ،، دیکھئے وہ جسقدر پیدا کیا
انجم غازیپوری — کیا برائی ہے دبے پاؤں جو آؤ جاؤ ،، برقع ہو زیب بدن پاؤں میں گھنگرو نہ رہیں

ان اشعار میں (۱) کسطرح کی ح (۲) ہاتھ کی ہ (۳) پھونک کا ک (۴) علم کا ع نیز (۵) برقع کا ع ساقط ہو کر عیب سخن کا باعث بنگیا ہے۔

(۲۵) شکست ناروا

فارسی اور اردو کی شاعری میں جو بحریں مروج ہیں انمیں سے بعض کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے میں ہر مصرعے کے دو ٹکڑے ہو جایا کرتے ہیں ایسے تمام اشعار میں اگر مصرعوں کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ نہ ہو سکیں بلکہ ایسا ہو کہ کسی لفظ یا فقرے کا ایک حصہ ایک ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ دوسرے ٹکڑے میں لازمی طور پر آتا ہو تو یہ بات یقیناً معیوب سمجھی جائیگی اور شاعر کی کمزوری پر دلالت کرے گی۔ شکست ناروا اسی عیب کا نام ہے۔ مثلاً

میر — نہ گیا خیال زلف سیہ جفا شعاراں ،، نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روزگاراں

یہاں "زلف سیہ" کا پہلا حصہ یعنی زلف مصرع اول کے پہلے ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ یعنی سیہ مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں واقع ہے۔ اسکو عیب شکست ناروا کہتے ہیں۔

عاشق دہلوی — تھا اضطراب دل کا جس خط میں حال لکھا ،، سو بار بند کرنے پر بھی کھلا رہا ہے

"بند کرنے پر" ایک فقرہ ہے جسکا پہلا حصہ یعنی "بند کرنے" مصرع ثانی کے پہلے ٹکڑے میں اور دوسرا

حصے یعنی ہر مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں ہے اور یہی معیوب ہے۔
حفیظ جونپوری ؎ میدان امتحان سے کہتی ہے حیکو دنیا ۔ اللہ اپنے بندوں کو آزما رہا ہے
؎ اک آپ سے بچھڑ کر عالم کو بیچ جانا ۔ ملنے کا اب کسی سے بھی حوصلا نہیں ہے
جب ناشی اشق دہلوی کے شعر میں معیوب تھی وہی حفیظ کے دونوں اشعار میں بھی موجود ہے
یہاں بھی "بندوں کو" اور "کسی سے بھی" ایکساتھ ہونا چاہیئے تھا خواہ وہ مصرع ثانی کے پہلے
ٹکڑے میں ہوتے خواہ دوسرے میں۔ انکے ایک جزو کا پہلے میں اور دوسرے جزو کا دوسرے
ٹکڑے میں ہونا معیوب ہے اور بلا شبہ معیوب ہے۔
اقبال ؎ کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں ۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
"تڑپ رہے ہیں" کا پہلا حصہ یعنی تڑپ رہے مصرع ثانی کے پہلے ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ یعنی ہیں
مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں واقع ہوا ہے۔ اسی کو شکست ناروا کہتے ہیں اور یہی معائب
سخن میں داخل ہے۔

(۲۶) ایطائے جلی و دیگر عیوب قافیہ

قافیے کی جملہ خرابیاں عموماً اور ایطائے جلی خصوصاً ناگوار سماعت ہوتی ہیں اور اسلئے
معائب سخن میں داخل سمجھی جاتی ہیں۔ واضح ہو کہ قافیہ میں ایک لفظ کے لفظاً و معناً مکرر آنیکو
ایطا کہتے ہیں مثلاً بتخانہ و بتخانہ ۔ یاران۔ دشمنان ۔ ان قافیوں کے آخری حصوں یعنی نہ
اور ان جمع کی لفظاً و معناً تکرار میں شبہ نہیں۔ یہ ایطائے جلی ہے جو بلا اختلاف معیوب قرار
دیا جاتا ہے۔ البتہ جن قافیوں میں تکرار صریح نہ ہو اسے ایطائے خفی کہتے ہیں۔ ایطائے
خفی کے جائز یا ناجائز ہونے میں اختلاف ہے راقم الحروف کے نزدیک ایطائے خفی سے
بچنا بہتر ہے لیکن اسکو معیوب و متروک سمجھنا نہ مناسب ہے نہ صحیح۔
مرحوم شوق نیموی کی بھی اس باب میں یہی رائے تھی چنانچہ وہ اپنے مشہور رسالے اصلاح
میں لکھتے ہیں کہ "قافیہ کا بعینہ لفظاً و معناً مکرر لانا ایطا ہے البتہ اگر (۱) ایسے زوائد قافیے ٹھہرائے جائیں جو
اپنی اصلی حالت پر نہ رہے ہوں جیسے رنجور[۱] و مزدور[۲] ۔ نامہ[۳] اساو یا (۲) الف فاعل یا[۴] مصدری

---

[۱] رنجور و مزدور میں ور اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے اور اصل میں متحرک تھا یہاں ساکن ہے ۱۲۔ ایضاح [۲] نامہ اسادا
اصل میں نامہ سادہ تھا ہائے ہوز الف سے بدل گئی ہے ۱۲۔ ایضاح [۳] صرف الف فاعل ہو یا اسکے
بعد نون بھی ہو جیسے خندان۔ گریان ۱۲۔ ایضاح ۔

یا شین مصدری ہوں جیسے دانا بینا وشجاعت سخاوت وکاوش وسازش یا (۳) انکے حذف
کے بعد اکثر مزید[1] علیہ بے معنی ہو جاتے ہیں جیسے ادہرا ودہرا جدہر کدہر جہاں کہاں وہاں یہاں
اس جب کس آن جن کن - یا (۴) حروف علت علامت افعال ہندی متصل بحرف اصلی ہوں
جیسے ستارہا ستو رہو سکتے رہے وغیرہ تو ان سب صورتوں میں ایطائے خفی ہے ورنہ جلی ہے
جیسے ہنرور سخنور ستمگر تونگر عقلمند دردمند باغہا غنچہا محبوبان - معشوقان - آنکھیں
نظریں - چلتے - بھیجتے - وغیرہ دانا وبینا میں ایطا نہیں کیونکہ الف زائد تو ہیں مگر معنی مختلف ہیں
ایک جگہ الف فاعل ہے اور دوسری جگہ الف ندایہ ہے اسی طرح بتان ہڈیان[2] میں بھی ایطا نہیں
گو دونوں جگہ جمع کے الف دونوں ہیں مگر ایک جگہ جمع فارسی ہے اور دوسری جگہ جمع ہندی
ہے قلق مرحوم سے زائل نہیں ہوئی تپ عشق بتاں ہنوز :: پھکتی ہیں سوز غم سے مری ہڈیاں ہنوز
اسی طرح ان اشعار میں بھی ایطا نہیں - درزیرہ مین سراپا مظہر اسم خدا واللہ ہوں :: ہم صفیرو
اس چمن میں مرغ بسم اللہ ہوں - بحرسہ بحر درویشی طریقہ ہے رسول اللہ کا :: باندھی تسمہ
کمر میں عدد بسم اللہ کا - کیونکہ بوجہ اختلاف علمیت معنی میں تکرار نہیں - جب تم کو ایطا کی دونوں
قسموں میں اچھی طرح فرق معلوم ہو گیا تو یہ بھی جاننا چاہیے کہ اکثر فصحائے حال بجز [illegible] مزدور
دانا - بینا - خندان - گریان - شجاعت - سخاوت - کاوش[3] سازش - جن - کن[4] انکے ایسے ایطائے خفی
کو استعمال کرتے ہیں اور ان حروف علت کو ہندی میں بھی روا رکھتے ہیں جنکے بعد حروف وصل وخروج ہوں
جیسے ملایا[5] ستایا وغیرہ یا ایسی علامت فعل ہو جسکے حذف کرنے سے اسم فعل کا صیغہ امر نہ ہو سکے

---

[1] اکثر کی قید اسلئے ہے کہ متحرک الاوسط جو حالت جمع میں ساکن الاوسط ہو جاتی ہیں وہ بعد حذف علامت
جمع کبھی بے معنی بھی ہو جاتے ہیں جیسے نظریں بسکون ثانی مگر اکثر با معنی بھی رہتے ہیں اسی طرح ین کا کبھی مزید
علیہ کبھی بے معنی ہو جاتا ہے جیسے لڑکین بچپن ۱۲ ایضاح -

[2] بتان اور ہڈیان کے ایسے قافیے سے جنمیں بظاہر ایطا ہو اور دونوں قافیوں میں نازک
فرق ہو احتیاط چاہیے ۱۲ ایضاح -

[3] امیر - سنگدل تجھکو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک :: میری سوزش کیلئے غیر سے سازش کب تک

[4] جلال لکھنوی - ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے
نہیں ہے وعدوں میں ان گلوں کے وفا کی بو امتیاز کا رنگ

[5] ملایا اور ستایا میں الف اول اگرچہ علامت ہے اصلی نہیں مگر یہاں اسے قرار دیا گیا ہے
اور یے وقبل الف آخر خروج ۱۲ ایضاح

جیسے دکھا بیٹھا انھیں سے جب الف حذف کریں گے دکھہ بیٹھ رہیا ئیں گے ستا مٹا کے ایسے قافیوں سے احتیاط رکھتے ہیں۔ باقی رہے ادھر اُدھر جدھر کدھر ترا تری وغیرہ کے ایسے قافیہ انکو بھی اکثر استعمال نہیں کرتے۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اکثر عروض والوں نے لکھا ہے کہ غزل اور قصیدہ کے دوسرے تیسرے شعر میں وہی اور یردالاقافیہ مکرر لانا درست نہیں مگر یہ قاعدہ نہ فارسی میں مسلم رہا اور نہ اُردو میں حافظ شیرازی کی ہاردت ہاردت والی غزل اور عرفی وغیرہ کے قصیدے دیکھو لو ہرگز اس قاعدے کی پابندی نہیں ہے۔ بہرکیف اردو میں اگر مطلع تکرار جلی سے محفوظ ہے تو یقیناً اشعار میں تکرار کچھ مضائقہ نہیں۔"

ایطا کے علاوہ بعض دیگر عیوب قافیہ کی مثالیں ذیل میں درج کیجاتی ہیں،

سوداؔ ۔ پایا ہر ایک بات میں اپنے میں یوں تجھے ؛ معنی کو جس طرح سخن عاشقانے میں

یہ شعر سوداؔ کی اس مشہور غزل کا ہے جسکا مطلع یہ ہے ۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ظاہر ہے کہ اس مطلع میں حرف ی کے سبب سے زمانہ اور آشیانہ کی ہ ی سے بدلگئی ہے۔ لیکن "سخن عاشقانہ" میں ترکیب فارسی کی وجہ سے ہ میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے اسلئے مطلع کیساتھ مذکورہ بالا شعر کو پڑھتے پر صاف ظاہر ہوجائیگا کہ "زمانے میں" اور "سخن عاشقانہ میں" کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

غالبؔ ۔ دل اسکو پہلے ناز و ادا سے دے بیٹھے ؛ ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

اس شعر میں "تقاضے کا" کی جگہ "تقاضا کا" محض بضرورت قافیہ لکھا گیا ہے اور بلاشبہ معیوب ہے ضرورت قافیہ کیا ہے اسکے لئے غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

گلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا ۔ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اشرفؔ ۔ ساقی مئے گلرنگ پلا موسم گل ہیں ؛ دل خون ہوا ہے ہوس بنت عنب میں

اشرف کی اس غزل میں میں ردیف اور عنب۔ لب۔ ادب وغیرہ قوافی ہیں اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اردو اور فارسی میں قاعدہ ہے کہ صرف مطلع میں ردیف اور قافیہ کی شعر

کے دونوں مصرعوں میں موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ غزل کے باقی اشعار میں ردیف و قافیہ صرف دوسرے مصرعے میں آتا ہے۔ اگر کسی شعر کے پہلے مصرع میں بھی ردیف قافیہ دونوں موجود ہوں تو وہ شعر بھی مطلع ہو جائیگا لیکن اگر صرف ردیف آئے تو وہ معیوب قرار دیجائیگی مثلاً شعر اشرف کے مصرع اول میں حرف ہیں کی موجودگی معیوب ہے اسلئے کہ اس غزل کی ردیف بھی میں واقع ہوئی ہے۔

حفیظ جونپوری نے دل دیا اسکو جسے دل سے قدرداں دیکھا ٭ اسکی ہو بیٹھے جسکو مزاجداں دیکھا
حفیظ کا یہ مطلع ایطائے جلی کی پوری اور صحیح مثال پیش کرتا ہے اسلئے کہ اسمیں داں کی لفظی اور معنوی یکسانی ظاہر ہے۔

(۳۷) غلط العوام

زبانِ عوام پر جو غلط الفاظ جاری ہوگئے ہیں انکے استعمال سے بھی احتراز لازم ہے اس باب میں مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نے جنوری ۱۹۱۲ء کے اردوئے معلیٰ میں ایک بہت اچھا مضمون لکھا تھا جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:—

"اردو لکھنے والے اور نظم کرنے والے پہلے اس بات سے بے خبر نہیں کہ اس زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ ملے ہوئے ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔

ایک تو وہ الفاظ جنہیں اہل ہند نے لفظی و معنوی کچھ تغیر نہیں کیا جیسے الم و رقم وغیرہ ایسے الفاظ بے کھٹکے استعمال کر سکتے ہیں۔

دوسرے وہ الفاظ جن میں لفظی تغیر ہو گیا ہے مثلاً جو لفظ ساکن الاوسط ہے اسی متحرک الاوسط بولنے لگے ہیں جیسے حاجت کو حلف اور حرکت کو حرکت بولتے ہیں یا دیوانہ کو دوانہ اور بیگانہ کو بیانہ۔ اور المضاعف کو المضاف اور لیمو کو نیبو کہہ جایا کرتے ہیں یا جیسے موسم و موکب و موقع و موضع و موقع و مولد و مورد وغیرہ اور سید و جید و میت و نیز بین وغیرہ میں حرف آخر کے ماقبل فتح دیا کرتے ہیں حالانکہ صحیح یہ ہے کہ کسرہ پڑھیں یا جیسے حیص بیص کو ایک صاحب ایسر بیں سمجھے اور لیس کے ساتھ اسے قافیہ کر دیا۔ اس قسم کے الفاظ کا صحیح طور سے استعمال کرنا لازم ہے۔ عبارت میں تو اس غلطی کا پتہ نہیں لگتا۔ لیکن نظم میں حال کھل جاتا ہے اسیطرح

خون وجنون وزمین وآسمان وغیرہ میں ہندی اعلان نون کرتے ہیں اور حالت اعلان میں
یہ الفاظ ہندی ہو جاتے ہیں ایسے الفاظ کو ترکیب فارسی میں لاکر اعلان نون کا باقی رکھنا
غلطی ہے۔ کیونکہ اہل فارس کی زبان پر اعلان نون نہیں ہے اس غلطی سے بھی شعرا احتراز
کرتے ہیں تاکہ ترکیب میں ہندی و فارسی الفاظ کا خلط ملط نہ ہو جائے لیکن مع اور سوا اور
بعض یہ تین لفظ اسقدر زبان پر چڑھے ہوئے ہیں کہ بکسرہ اضافی ان الفاظ کو بے تکلف
ہندی لفظوں کیطرف مضاف کر دیتے ہیں اور یہ آفت معتبر لوگوں کے کلام میں بھی موجود ہے
مثلاً سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے۔ مع تین رقوم جواہر۔ بعض لوگ وغیرہ۔ یہ عامیانہ
محاورہ ہے اور لطف یہ ہے کہ مضاف الیہ میں کبھی کبھی کے بھی لگا دیتے ہیں مثلاً سوائے
تم لوگوں کے میرا کون ہے۔ مع لڑکے بالوں کے روانہ ہوا۔ اسیطرح سے لفظ بعض اشخاص میں
کسرۂ اضافی سے تخفیف کرتے ہیں اور بعض اشخاص اور بعضی عورت اور بعضے لوگ کہتی ہیں مگر
جو لوگ لکھے پڑھے ہیں وہ اس سے بھی اپنی تحریر و تصنیف میں احتراز کرتے ہیں تیسرے وہ
الفاظ عربی و فارسی کے جنمیں معنوی تغیر ہو گیا ہے اہل زبان اس لفظ کو اور معنی میں لیتے
ہیں اہل ہند اور معنی میں بولنے لگے مثلاً محرم کا لفظ اردو میں چھوٹے کپڑوں کے معنی پر مستعمل
ہے یا تردد کا لفظ عربی میں آمد و رفت کے معنی پر ہے اور اردو میں فکر و تشویش کے معنی پر
بولتے ہیں یا جیسے لفظ نم فارسی میں تری کے معنی پر ہے اور اردو میں تر کے معنی پر بولتے
ہیں یا جیسے لفظ خفت اردو میں شرمندگی کے معنوں پر مستعمل ہے۔ اس قسم کے جمیع
الفاظ کا تتبع و تفحص کرنا چاہیئے اور ان سب الفاظ کو ہندی سمجھنا چاہیئے اور ترکیب
فارسی یا عربی میں جسطرح ہندی الاصل لفظوں کو لانا غلط ہے اسی طرح ان الفاظ کا
استعمال بھی ہر اہل قلم کے لئے اضافت و عطف فارسی وغیرہ میں ناجائز ہوگا یعنی
جسطرح کپڑہ رنگین کہنا صحیح نہیں اسی طرح محرم رنگین اور چشم نم کہنا بھی ناجائز ہے کیونکہ
کسرۂ توصیفی ترکیب فارسی کے لئے مخصوص ہے۔ ان تینوں قسموں کے علاوہ ایسے لفظ
بھی اردو میں بہت سے بولے جاتے ہیں کہ جو ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے انکو
اشتقاق کرلیا ہے اور اہل زبان اس اشتقاق سے بے خبر ہیں مثلاً تموز تو فارسی لفظ ہے

اس سے ہندیون نے تمازت نزاکت کے قیاس پر مصدر عربی بنالیا اور قیاس ہرگز درست نہیں اسی طرح علالت نجالت ذہانت لیاقت شمولیت ملت یگانگت وغیرہ ہندیون نے قیاس سے مصدر بنائے ہیں ایسے الفاظ کا استعمال اکثر تو ناجائز ہے اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے جیسے بادشاہت وغیرہ تو اسے ہندی لفظ سمجھنا چاہئے کسرۂ اضافی یا توصیفی یا کسی اور ترکیب عربی فارسی کیساتھ اسکو استعمال کرنا درست نہیں مثلاً جسطرح پیارو چاہت بعظمت فارسی کہنا جائز نہیں اسیطرح امارت بادشاہت کہنا بھی نادرست ہے۔

بعض الفاظ میں یائے مصدری زیادہ کیجاتی ہے حالانکہ وہ سب الفاظ خود معنی مصدری رکھتے ہیں یہ بھی ہندیون کا تصرف ہے جیسے انتظاری۔ تغافلی طغیانی۔ غلطی صفائی۔ ادائی اجرائی وغیرہ بعض الفاظ میں علامت جمع زیادہ کر دیتے ہیں حالانکہ وہ سب الفاظ خود جمع ہیں جیسے اغیارون۔ کغارون۔ امداحون۔ آثارون۔ اعمالون۔ یا یہ کہ وہ لفظ فارسی و ہندی ہیں علامت جمع عربی کی اسمیں لگادی جیسے جاگیرات۔ دیہات۔ باغات۔ جہازات۔ بتات وغیرہ اسی طرح لوازمات۔ داحکامات کو بھی سمجھ لیجئے۔ یا اسیطرح اسم صفت بہت سی ہیں جو ہندیون نے تراشے ہیں جیسے حرفتی صنعتی بیٹھکی گھمنڈی۔ جوشیلا شوقین۔ سمجھدار۔ وضعدار طرحدار تابعدار وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ کا تفحص کرنا اہل علم کو ضرور ہے ورنہ خطا سے نہیں بچ سکتے۔

اس باب میں کچہریون کے محررون نے اور ضوابط و قوانین کے مترجمون نے بہت غلطیان کی ہیں صدہا اصطلاحات قیاس سے بنا بنا کر زبان اردو میں داخل کر دیئے وہ سب کے سب غلط ہیں ان اصطلاحات کے مقام پر صحیح لفظ کو ڈھونڈھکر استعمال کرنا مضمون بلیغ و بدیع پیدا کرنے کے برابر حسن رکھتا ہے کہ لفظیکہ تازہ ہست بمضمون برابر است۔ بعض الفاظ اردو میں ایسے زبان زد ہیں کہ انکا کچھ پتہ نہیں لگتا کہ کس زبان کے ہیں اور اصل انکی کیا ہے جیسے الغارون زرغل۔ الماغوجی القات۔ مرزتی۔ مزمہ وغیرہ جنمیں کے اکثر مجھے اسوقت یاد نہیں آتے یہ سب الفاظ عامیانہ سمجھے جاتے ہیں اور اہل ادب ان سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

بعض الفاظ عربی الاصل اردو میں اسطرح مل گئے ہیں کہ انکا بدل نہیں ہوسکتا اور پھر اصل معنی بھی انمیں باقی نہیں رہے۔ جیسے واسطے طرح۔ معاف۔ وغیرہ ممکن ہی نہیں کہ انکی

تصحیح کیجائے البتہ یہ غلط سمجھا جائیگا کہ تقریبًا کے محل پر قریبًا یا اندازًا لوگ لکھا کرتے ہیں یا حال کے محل پر لفظ موجودہ اور وہ بھی بلا لحاظ تذکیر و تانیث استعمال کرتے ہیں مثلًا موجودہ وزیر نے یہ حکم دیا۔ یہ فقرہ اہل دفتر حیدرآباد کے اس فقرہ سے کم نہیں۔ کہ سالار جنگ اولیٰ نے یہ انتظام کیا۔ اس قسم کے متحدث محاورے اس سبب سے غلط ہیں کہ انکی تصحیح کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے دوسرے یہ کہ بعض لوگوں کے نکالے ہوئے یہ الفاظ ہیں یعنی محاورہ عام نہیں ہے بلکہ محاورہ عوام ہے۔

جو الفاظ کہ محاورہ عام میں داخل ہوں وہ کیسے ہی غلط ہوں انکی تصحیح مخل فصاحت ہے جیسے لایعقل۔ ولاابالی بلا لحاظ ضمیر متکلم و غائب بولتے ہیں اور اس کی تصحیح کو غلط سمجھتے ہیں اسی کے مثل لفظ یعنی ہے کہ اس میں ضمیر غائب کا لحاظ مطلق نہیں کرتے یعنی چہ اور معنی چہ کا اعتراض اور اسکا جواب کہ شعر مرا بمدرسہ کہ برد مشہور و معروف ہے مولوی جامی کہتے ہیں۔ قطعہ میخانہ کہ سعادت ہلالش + باد از غبار غیر خالی - احرام حریم آن نہ بندند جز دردکشان لاابالی - میں کہتا ہوں کہ لاابالی نہیں لاابالوں کہنے کا مقام ہے۔ اصل جواب ان اعتراضوں کا یہی ہے کہ محاورہ عام میں قیاس نحوی کو دخل نہیں ہے غلط عام فصیح ہے اور اسکی تصحیح مخل فصاحت اور غلط عوام غیر فصیح و مکروہ ہے اور اسکی تصحیح واجب ہے

بعض الفاظ میں صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اصل انکی کچھ اور تھی لیکن دہلی اور لکھنؤ کے لوگوں نے تصرف بیجا کیا ہے مثلًا جھکولے کو ہچکولا کہنا دونوں شہروں کا محاورہ ہے مگر میرے خیال میں جھکولا ہی فصیح ہے اور قدیم اردو یہی ہے قدمائے شعرا کے کلام میں یہ لفظ موجود ہے۔ اسیطرح لفظ چیدہ میں تصرف کرکے دہلی و لکھنؤ کے لوگوں نے چنیدہ کہنا شروع کیا اور یہی عامیانہ محاورہ ہے۔ جھلک میں اہل لکھنؤ نے تصرف کرکے جھلکی بنا دیا۔ شاہزادہ میرزا آسمان جاہ مرحوم کا ایک شعر مجھے یاد ہے ؎ سرک جاتے ہیں اک جھلکی دکھا کر + کہ رہجائے جھڑک کر دل کسیکا۔ اور اہل دہلی نے تصرف کرکے جھلکا بنایا مرزا داغ مرحوم کہتے ہیں ؏ اپنے کوٹھے سے جو کل اسنے دکھایا جھلکا۔ مگر جھلک دونوں سے فصیح ہے بعض الفاظ دہلی میں اپنی اصل پر ہیں اور اہل لکھنؤ نے تصرف کیا مثلًا دھکیلنا دال

ابجد سے دہلی کی زبان ہے اور ڈھکیلنا دال ہندی سے لکھنؤ کا محاورہ ہے اسی طرح کھردرا کو مخفف کرکے اہل لکھنؤ کھدرا کہتے ہیں۔ مگر مجھے کھردرا ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں اور محاورہ میں مفرد بولے جاتے ہیں جیسے ارواح اوقات۔ اولاد۔ بعض مفرد ہیں اور محاورہ میں جمع بولے جاتے ہیں مثلاً اسکے کیا معنی۔

جو خالص زبانیں دنیا میں ہیں ان میں اہل دہ کا محاورہ مستند سمجھا جاتا ہے اس سبب سے کہ اہل شہر کی زبان غیر قوموں کے خلط سے محفوظ نہیں رہتی۔ ابتدائے اسلام میں جب عربی کی زبان بگڑنے لگی تو اہل بادیہ و اعراب سے زبان کو مطابقت دیا کرتے تھے لیکن اردو مخلوط زبان ہے۔ اسکا معاملہ برعکس ہے۔ اہل شہر کی اردو بہ نسبت اہل دہ سے اچھی سمجھی جائیگی تعجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے تھوڑی دور باہر جائیے تو آنکھیں کہنے کے بدلے انکھیں بفتح کاف اور گلا گھونٹنے کو گھونٹنا بواؤ مجہول اور جاگنے کو جگنا بولتے ہوئے سن لیجیے یہی حال دہلی کے اہل دہ کا ہے آنے کو آنا اور روٹی کو روٹی بتشدید۔ پانی کو پاڑین۔ بولتے ہیں اور دہلی کے قریب کے رہنے والے ہیں فیض آباد و آگرہ دونوں شہر لکھنؤ و دہلی سے کوسوں دور ہیں لیکن اردو وہاں کی میری رائے ناقص میں اردوئے دہلی ہے شاید اتنا بھی اختلاف نہ نکلے جتنا دہلی اور لکھنؤ کا لکھا گیا۔"

مولانا علی حیدر صاحب کی تحریر میں محاورہ عام اور محاورہ عوام کی تصریح بخوبی ہو چکی ہے کہ محاورہ عام کتنا ہی غلط ہو اسکے استعمال میں مضائقہ نہیں البتہ محاورہ عوام جو صرف بعض عوام اور جہلا کے دائرہ تک محدود ہوتا ہے اسکا استعمال بیشک معیوب اور قابل ترک ہے مثلاً

میر سہ تابوت مرا دیر اٹھا اسکی گلی سے ۔۔۔ اثبات ہوا جرم محبت کا اسی سے"

" سہ ان طیوروں سے ہوں میں بھی اگر آتی ہو صبا ۔ باغ کے چاروں طرف آگ لگا دیتے ہیں"

اثبات ہوا یعنی ثابت ہوا محاورہ عوام ہے طیور جمع ہے ایسی حالت میں "طیوروں" سے لکھنا اسی طرح معیوب ہے جس طرح "شعراؤں سے" یا "علماؤں سے" کا لکھنا

سودا سہ تو تو اس معنی سے کیا شاد ہوا ہوویگا ۔ پوچھیے اہل دلوں سے کہ وہ کیا کہتے ہیں

" سہ تجھکو فقط چراغ شام ڈھونڈھتے نہیں گھر گھر ۔ پھرتی ہے باد صبحگاہ خانہ بخانہ کو بکو

سوداؔ ـ غم کا سیر خوانده اور درد کا پالیده ∴ مضمون جو طبیعت کا سوداؔ کی ہے زائیده
″ ـ اس چشم کا غمزه جو کرے قتل دو عالم ∴ گوشے کو نگہ کے نہیں پرواه کسیکی

"اہل دل" کے بجائے "اہل دلوں سے"، "گھر گھر" کی جگہ "گھر گھر"۔ پالیده بمعنی پرورش کرده اور "پرواه" بجائے پروا۔ یہ سب عوام کی زبان ہے اور اسلئے معیوب اور قابل ترک

شاہ عالم ـ نہ پھول اب اسقدر بلبل گلوں کی آشنائی پر ∴ کہ اہل چمن ہنستے ہیں تیری اتقائی
میر سوز ـ سرحق دلمیں انہوں کے ہو دے آگه کہاں ∴ کونج کیا جانے فقیروں کے ان اسراروں کو
″ ـ نہیں پرواه قاصد کی ہمیں اب ∴ ہمارا دل ہی جا جا نامہ بر ہے
قائم ـ میں دیکھا خاک تھا باطن میں جن بے کرم خورده ∴ بظاہر گرچہ نظروں میں ترا بیمار بہتر تھا

حمق یا "احمق پن" کی جگہ احتقائی! "اسرار کو" کی جگہ "اسراروں کو" "پروا" کے بجائے "پرواه" اور "کرم خورده" کے بجائے "کرم خورده" یہ سب غلط العوام کی مثالیں ہیں۔

میر حسن ـ قیامت مجھ پہ شب اسکا تظلم اور ترحم تھا ∴ کبھی تھیں گالیاں منہ پر کبھی لب پر تبسم تھا

تظلم بمعنی فریاد کو ظلم کے معنی میں استعمال کرنا جہلا کی زبان ہے۔ مگر میر حسن سے لیکر بعض متاخرین تک نے اسکے استعمال سے پرہیز نہیں کیا ہے۔ مثلاً

شاہ نصیر ـ بس کر ستم ایجاد کہ عالم میں قیامت ∴ برپا ہے ترے دست تظلم سے زیاده
عاشق دہلوی ـ کبھی ختم آپ کے جور و تظلم ہو نہیں سکتے ∴ کبھی پورا ہمارے غم کا دفتر ہو نہیں سکتا
مصور فرکا گوروی ـ قاصد پیام وصل کی دے ہے کسے خوشی ∴ میں عقربیت مرگ ہوں وه مجھسے دور ہے
تنویر دہلوی ـ دامن گل سے بھی ہلکا وزن دامن ہے ∴ اسپہ بھی بار اسے اک اک شکن دامن پر ہے
″ ـ جذبۂ دل نے مرے کچھ تو کری ہے تاثیر ∴ پھر ہوئی انکی جو الطاف و عنایات شروع

وزن بسکون زا صحیح ہے اسکو وزن کہنا عوام کی زبان ہے۔ علی ہذا القیاس کی کے بجائے کری بھی دہلی یا یو پی کے بعض مغربی اضلاع مثل علیگڑھ و بلند شہر وغیره کے جہلا کے سوا اور کوئی نہیں بولتا۔ مگر تنویر دہلوی نے اس قسم کے اکثر الفاظ کو دیده و دانستہ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی رائے میں غلط العوام کو بھی جائز سمجھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کین کے بجائے کرین عاشق دہلوی شاگرد غالب کے کلام میں بھی موجود ہے ملاحظہ ہو:-

؎ فرقت کی رات کتنی دعائیں کریں ہیں دل نے ۔ قسمت نے اپنی کیسی لگائی اثر میں آگ

عاشق دہلوی ؎ نظر لطف وکرم اور ہے اغیار دن پر ۔ ظلم کی اور نگاہیں ہیں وفادار دن پر

" ؎ ہمیں تو اس دل نالاں نے کر دیا بدنام ۔ وگرنہ عشق کا یوں شہرہ گھر گھر ہو جائے

" ؎ اعدا کے عشق میں سبھی کچھ یہ گمایا ۔ بھلا سادہ انداز و ادا ناز کہاں سے

داغ دہلوی ؎ شکل اصلی سے کبھی رنگ تبدل نہ ہوا ۔ غنچہ گل ہو کے کھلا گل کبھی بلبل نہ ہوا

تبدل کے بجائے تبدیل فصحا کی زبان ہے تعجب ہے کہ داغ نے اسکو کیونکر جائز کہا۔

بحر لکھنوی ؎ قفل توڑیگا اب وہ زورِ صبا گنج شہیدان کا

قفل صحیح بسکون فا ہے۔ اسکو قفُل کہنا درست نہیں ہو سکتا۔

حفیظ جونپوری ؎ یہ سنتے تھے ترک محبت ہے مشکل ۔ بجبر اگر اسکو بھی کر کے دیکھا

بہ جبر چاہیے یا جبراً۔ بجبراً لکھنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

حفیظ جونپوری ؎ اجل کی بیرخی نے مار ڈالا ۔ طول زندگی نے مار ڈالا

طول زندگی کے بجائے طویل زندگی، جہلا کے سوا اور کہیں سننے میں نہ آئیگا۔

داغ دہلوی ؎ قاتل نے میرے اپنی پریت کے واسطے ۔ لکھا گزشتہ سنہ مرے لوح مزار پر

حسرت موہانی ؎ حادثے سنہ آٹھ میں گزرے بہت اب دیکھئے ۔ کیا دکھاتا گردش لیل و نہار اگلی برس

(۲۸) حشو

حشو اس لفظ زائد کو کہتے ہیں جسکے حذف کرنے سے کلام میں حسن پیدا ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جس شے کا حذف وجود حسن کا باعث ہو اسکی موجودگی شعر میں یقیناً معیوب ہوگی۔ مثلاً

میر ؎ سمجھا تھا تنگ اپنے تو سود و زیاں کو میں ۔ مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں

" ؎ آخر ہماری خاک بھی برباد ہو گئی ۔ اس کی ہوا میں ہم پہ تو بیداد ہو گئی

سودا ؎ خدا کیواسطے اسے تند خو نہ ہو بدنام ۔ یہ خون بیگناہان کر کے تو نہ ہو بدنام

قائم ؎ کیا حسن وفا جسکے پیر سینے میں ہوئی تھا ۔ اس دل کی طرح جسکو لگے بے خبر آتش

میر کے اشعار میں تو اور سودا و قائم کے اشعار میں یہ بالکل زائد ہے اسی کو حشو کہتے ہیں اور یہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

یہی حال میر حسن اور جرأت کے مندرجۂ ذیل اشعار کا ہے کہ ان میں بھی حرف "یہ" بیکار ہے۔

میر حسن ؎ کسکی سینہ زنی نہیں آج یہ بتاں فریاد :: انہوں کے ہاتھوں سے لیجاؤں میں کہاں فریاد

جرأت ؎ جدا جانے کریگا چاک کس کس کے گریباں کو :: ادا سے اسکا چلنے میں اٹھالینا یہ داماں کو

سودا ؎ رنگین سخن اسکے نے دل خلق کو موہا :: سودا یہ مگر طوطی گلزار سخن ہے

یہ اور تو کی طرح اب اور بس بھی عموماً برائے بیت اور حشو محض ہوا کرتے ہیں مثلاً

مصحفی ؎ انگڑائی لیکے اپنا مجھ پر خمار ڈالا :: کافر کی اس ادا نے بس مجھکو مار ڈالا

جرأت ؎ لعل لب پر جو نہیں بس اسنے لگائی مسی :: شفق شام سے بہتر نظر آئی مسی

قلق میرٹھی ؎ اس ماہ نے یہ راہ دکھائی تمام شب :: بس خواب میں بھی نیند نہ آئی تمام شب

سحر لکھنوی ؎ دل مثل نصیری اب اے بندہ نواز آیا :: مر مر کے جیا پھر بھی جانباز نہ باز آیا

سودا ؎ بے چین جو رکھتی ہے تمہیں چاہ کسو کی :: شاید کہ ہوئی کارگر اب آہ کسو کی

عزیز لکھنوی ؎ کہنے کا قصہ کچھ ہے نکلتا ہے منہ سے کچھ :: کیوں نامہ بر سے مل مرا اب بدگمان ہو

میر حسن ؎ کہتا نہیں کہ مجھسے ہر اک خوبرو ملے :: کوئی ملے کہ یا نہ ملے ایک تو ملے

آشفتہ ؎ نعش عاشق شامیانہ کی نہیں محتاج ہے :: میری میت پر ہے سایہ دامن فریاد کا

داغ ؎ ہمت کا ہارنا نہ مصیبت میں چاہیئے :: تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہیئے

حسن کے شعر میں کہہ، آشفتہ کے شعر میں ہے، اور داغ کے مطلع میں بھی زائد اور حشو ہے

ناد ؎ جلوے نہیں ہیں جام ایک رنگ شراب کے :: شیشے میں پھول ڈالدیئے ہیں گلاب کے

اس مطلع میں "ایک" بالکل حشو ہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ اگر اسکو حذف کرکے اسکی جگہ رنگ کا لفظ بنا دیا جائے تو حسن شعر میں نمایاں ترقی ہو جائے ؎

جلوے نہیں ہیں جام میں رنگ شراب کے — شیشے میں پھول ڈال دیئے ہیں گلاب کے

مجروح ؎ کیا بتاؤں نشان منزل دوست :: دیر و کعبہ تو اسکی راہ میں ہیں۔

اس شعر میں "تو" حشو ہے اسکو دور کرکے دیکھ لیجئے ؎

کیا بتاؤں نشان منزل دوست — کعبہ و دیر اسکی راہ میں ہیں

آسی سکندرپوری ؎ دولت پابوس پاکر کیونکر نہ ہوتا سربلند :: میں تو کب سے زلف دراز یار سودائی نہ تھا

یہاں تو بیکار اور بے موقع ہے دوسرا مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔ کچھ یں اے زلف دراز یا سودائی نہ تھا

(۲۹) ذو معنی مشتقات مصدر کا استعمال

ذو معنی مشتقات مصدر کے استعمال کو بعض حضرات حسن کلام کا موجب سمجھتے ہیں۔ لیکن راقم حروف کے نزدیک اس سے احتراز لازم ہے اسلئے کہ ایسی دور از کار باتوں کی بے لطفی ضلع جگت کی بے لطفی سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ مثلاً

غالب ؎ نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ؛ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

ایک سفیدی چشم یعقوب کی جو دیوار زنداں پر شوق تلاش و دیدار حضرت یوسف میں پھرتی ہے۔ یعنی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ دوسری سفیدی جو مکان پر آرائش اور صفائی کی غرض سے پھرتی ہے یعنی کی جاتی ہے۔

؎ ہجر میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے ؛ بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکو

ایک اٹھانا سر کا۔ دوسرے اٹھانا یا برداشت کرنا بات کا

آتش سکندر پوری ؎ ہم نہ تابوت عدو میں نہ رہ رسم وفا ؛ آپ اٹھ جائینگے تم ہم کو اٹھاتے کیوں ہو

آپ اٹھ جائینگے یعنی ہم خود اٹھ جائینگے۔ بس ایک اٹھنا اپنا اٹھنا جسکے معنی چلے جانے کے ہوئے۔ دوسرا اٹھنا تابوت عدو کا یا اٹھنا راہ و رسم وفا کا جسکے معنی راہ و رسم موقوف ہو جانے کے ہوئے۔

(۳۰) زیادتی زحاف یا رکن

واضح ہو کہ عربی کے بعض اوزان ایسے ہیں جنمیں کبھی کبھی ہوشیار اور کہنہ مشق شعراء کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے اور نادانستہ طور پر کوئی رکن یا حصہ رکن کم یا زیادہ ہو جاتا ہے مثلاً۔

عاشق دہلوی ؎ ترے وعدے کو ہم سمجھیں غنیمت ؛ قیامت کو کبھی گر وفا ہو گیا

یہاں پہلے مصرعہ کا وزن "فعولن فعولن فعولن فعولن" ہے مگر دوسرے مصرع میں صرف "فعولن فعولن فعولن فعل" رہ گیا ہے۔ یہ کمی کی مثال ہوئی۔ زیادتی کی مثال کے لئے مرزا غالب کی رباعی ملاحظہ ہو،

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب ؛ دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی اپنی شرح دیوان غالب میں لکھتے ہیں کہ :-

اس رباعی کے دوسرے مصرع میں دو حرف وزن رباعی سے زائد ہو گئے ہیں اور ناموزوں ہے مخالف چھاپے کے سب نسخوں میں بھی اور حسن نسخہ کی کا بیان خود مصر حوم کی صحیح کی ہوئی ہیں انہیں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے اوزان رباعی میں سے جس وزن میں سبب خفیف سب سے زیادہ ہیں وہ یہ مصرع مشہور ہے ع - یا می گویم نام تو یا می گریم اس وزن پر اگر اس مصرع کو کھینچیں یوں ہونا چاہیئے دہے دل رُک رُک بند ہو گیا ہے غالب اور اس صورت میں زمین بدل جاتی ہے غالباً اسی فارسی مصرع نے مصر کو دھوکا دیا۔

(۳۱) قافیہ ت د ط وغیرہ

ت اور ط کا قافیہ بھی مثل س ث اور ص ہ اور ح یا ذ اور ض د ظ کے قافیوں کے معیوب اور قابل ترک ہے - مثلاً

رشک ؎ وقت حساب کثرت اغیار وصل میں بکتے ہیں بات ٹال کے گنتی غلط ہوئی

واضح ہو کہ اس غزل کے دیگر قوافی صفت بکت وغیرہ ہیں انہیں کی رعایت سے رشک نے غلط کو غلت لکھدیا۔

(۳۲) "کے سے" کی جگہ "کے ایسے"

لکھنؤ اور نواح لکھنؤ میں "کے سے" کی جگہ بات چیت کے وقت "کے ایسے" بھی بولتے ہیں - یہ تقریر میں جائز ہے مگر تحریر خصوصاً نظم میں بلا شبہ اچھا نہیں معلوم ہوتا مثلاً۔

محشر لکھنوی ؎ ہزاروں مر گئے مجنوں کے ایسے دیوانے ۔ مگر ملی نہ کسی کو بھی انتہائے بہار

(۳۳) ہی حرف حصر کا غلط استعمال

ہی حرف حصر کے متعلق قاعدہ مقررہ یہ ہے کہ اسکو اُس لفظ کے بعد ہی بلا فصل استعمال کرنا چاہیئے جس پر زور دینا منظور ہو مگر آجکل اہل پنجاب عموماً اور کبھی کبھی اہل دہلی اسکے خلاف بھی لکھ جاتے ہیں مثلاً ؎

اثر ؎ اس سے ہی کوئی وصل کی صورت نکل آتی ۔ عکس آپ کا آئینہ سے باہر نہیں ملتا

؎ ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گذاری تمھیں نے رات ٭ تم نے ہی انتظار کیا ہم نے کیا کیا

پہلے شعر میں "ہی" کو "اس" کے بعد ہونا چاہیئے تھا یعنی "اس ہی" جسکو اردو زبان والے "اسی" کہتے ہیں "اس سے ہی" کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں بھی "تم نے ہی" کے بجائے "تم ہی نے" یا "تمھیں نے" ہونا چاہیئے جیسا کہ پہلے مصرع میں موجود بھی ہے۔

(۳۴) اردو میں بعض الفاظ مثل سیہ و گنہ کا استعمال بلا اضافت

فارسی میں سیاہ کو سیہ اور گناہ کو گنہ بھی بولتے ہیں پس فارسی اضافت کیساتھ اردو میں بھی زلف سیہ یا ذوق گنہ لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن بلا اضافت تنہا لفظ سیہ یا گنہ کا استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا مثلاً

داغ ؎ عشق کیا جرم ہے انسان کیلئے اے واعظ ٭ اس گنہ کی بھی مکافات ہوا کرتی ہے

؎ عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط ٭ یہ گنہ بھی ہے یہ ثواب بھی ہے

(۳۵) بے پردگی و سخافت مضمون

مضمون کی سخافت اور بے پردگی سے بچنا لازم ہے۔ ورنہ کلام کے بازاری یا مکروہ ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مثلاً

داغ ؎ کیا رہیں ہم کہ ترا چال چلن ٭ پاس رہکر نہیں دیکھا جاتا

یہاں چال چلن کے بے پردہ لفظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کی عفت و عصمت مشکوک ہے۔ اس مضمون کی رکاکت ظاہر ہے۔

داغ ؎ جب وہ نادان عدو کے گھر میں بڑا ٭ داغ اک داغ کے جگر میں پڑا

گھر میں بیٹھنے کا مضمون زنان بازار کے سوا کسی سے متعلق نہیں ہوسکتا اسلئے صریحاً معیوب اور مذموم ہے

داغ ؎ یہ فرمایا انھوں نے دیکھکر تصویر یوسف کی ٭ اسے تو مول وہ لے جو کوئی آنکھوں کا اندھا ہو

اس شعر میں آنکھوں کا اندھا کہکر ایک طور پر حضرت یعقوبؑ پر پھبتی کسی ہے۔ استغفر اللہ

داغ ؎ میت پہ میری آکے دل انکا دہل گیا ٭ تعظیم کو جو لاش مری اٹھ کھڑی ہوئی

میت اور لاش وغیرہ مکروہ الفاظ کے علاوہ میت کا اٹھ کھڑا ہونا بالغایت ناگوار اور تحقیر مضمون ہے۔

(غلام حسنین قتیل لکھنوی)

نکاتِ سخن

اس کتاب میں پانچ باب اور ہر باب میں کئی فصلیں اور پھر ہر فصل میں متعدد عنوان ہیں۔

(۱) باب اول متروکاتِ سخن (۲) باب دوم معائبِ سخن (۳) باب سوم محاسنِ سخن (۴) باب چہارم نوادرِ سخن (۵) باب پنجم اصلاحِ سخن۔

باب اول متروکاتِ سخن

اسکی پانچ فصلیں ہیں (۱) متروکاتِ قدیم (۲) متروکاتِ معروف (۳) متروکاتِ جائز (۴) متروکاتِ بیجا (۵) قابلِ ترک۔

(۱) فصل اول متروکاتِ قدیم: یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہدِ قدیم کے کلام میں پائے جاتے ہیں تفصیل ان کی اصل کتاب میں دیکھنا چاہیئے۔

(۲) فصل دوم متروکاتِ معروف: یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہدِ متوسط کے کلام میں پائے جاتے ہیں

(۳) فصل سوم متروکاتِ جائز: یعنی شعرائے عہدِ آخر و دورِ حاضر کے وہ متروکات جنکے ترک کو راقم الحروف جائز سمجھتا ہے۔

(۵) فصل چہارم متروکاتِ بیجا۔ یعنی شعرائے دورِ آخر و عہدِ حاضر کے وہ متروکات جنکے ترک کرنیکی راقم الحروف کے نزدیک کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

(۵) قابلِ ترک۔ یعنی وہ الفاظ جو اس وقت تک عموماً مستعمل ہیں اور جائز سمجھے جاتے ہیں لیکن راقم الحروف کے نزدیک جنکا ترک اولی ہے۔

ان فصلوں کے متعدد عنوانات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

متروکاتِ معروف

(۱) آئیاں جائیاں وغیرہ (۲) پیاسا بااعلان یا (۳) تئیں (۴) ٹک (۵) جائے بمعنی جگہ۔ (۶) حذفِ "نے" علامتِ فاعل (۷) رہوے بجائے رہے (۸) زور (۹) سوا بجائے "کے سوا" (۱۰) عنایات (۱۱) کسو، کبھو (۱۲) وانت (۱۳) دیا بجائے "یا" (۱۴) وو ہیں بجائے "وہیں" (۱۵) ہم بھی

متروکات جائز

(۱) اُس پاس۔ اُس کنے (۲) آن کے (۳) آئے ہے جائے ہے (۴) "ادری" بجائے "اُدھر" (۵) الفاظ فارسی ثقیل ناگوار۔ گذرا وغیرہ (۶) بلبے (۷) پرے (۸) اپنے بجائے پن۔ (۹) پہ بجائے پر (۱۰) باسے (۱۱) پیچ (۱۲) تھوڑی بجائے "تھوڑا ہی" (۱۳) جون بمعنی مانند (۱۴) جو کہ "جو" بجائے "جو" (۱۶) عاقبت (۱۷) کیونکہ بجائے کیونکر (۱۸) کچھے دیئے بجائے کیجئے دیجئے (۱۹) کیسو دیکود (۲۰) اگر بجائے اگر (۲۱) لیوے دیوے (۲۲) لگ چلنا (۲۳) ماسے (۲۴) بھی شاید (۲۵) "فے" بجائے "نہ" (۲۶) وصلت (۲۷) وابکے لیکن۔ واکین

متروکات بیجا

(۱) مت (۲) یاں وان (۳) تلک (۴) اور بروزن فع (۵) جیو وغیرہ

قابل ترک

(۱) الفاظ کریہ جیسے الفاظ متعلق بہ کفن دفن۔ لاش وغیرہ (۲) الفاظ فارسی کا استعمال بلا اضافت (۳) اضافت بزرگان (۴) آپ جیسا بجائے آپ سا (۵) الف ندائیہ مثلاً "دلا" (۶) ترکیب فارسی کے ساتھ جمع کے بجائے واحد کا استعمال (۷) لون بمعنی نمک (۸) سا لہا بجائے سا لہا سال (۹) مقامات جمع بجائے مصادر (۱۰) میرے مہربان بہادر (۱۱) "نہ" بجائے "نہیں" (۱۲) یہ بمعنی اسقدر۔ نوٹ :۔ رسالہ متروکات سخن کا حجم چار جزو اور قیمت ۶ر مقرر ہے۔

نوٹ :۔ باب سوم محاسن سخن باب چہارم نوادر سخن اور باب پنجم صلاح سخن زیر طبع ہیں۔

فہرست کتب موجودہ دفتر اردوئے معلی کانپور

جلد رسالہ اردوئے معلی بابت سنہ ۱۹۰۶ء و سنہ ۱۹۰۷ء مجلد	للعہ	انتخاب سخن جلد اول سلسلہ شاہ حاتم	عہ
جلد رسالہ اردوئے معلی بابت سنہ ۱۹۰۸ء و سنہ ۱۹۰۹ء	ع۱۲	انتخاب سخن جلد دوم سلسلہ ذوق	۱۰ر
کلیات حسرت موہانی مکمل	ع۲	انتخاب سخن جلد سوم سلسلہ مومن	۵ر
دیوان حسرت موہانی مکمل	۱۴ر	" جلد چہارم سلسلہ مظہر	۴ر
دیوان حسرت معہ ترجمہ انگریزی	عہ	" جلد پنجم سلسلہ جرات	۱۰ر
دیوان غالب معہ شرح حسرت	عہ	دیوان مصحفی ۸ر دیوان برق ۲ر دیوان سوز	۳ر
رسالہ متروکات سخن ۶ر رسالہ معائب سخن	۶ر	دیوان نازش بدایونی ۲ر دیوان نوبت رائے نظر	۲ر